

کو ملیس کے دلیں بیس

جن ناگہ آزاد

مکتبہ جامعہ میونسپل
کاؤنٹی دہلی

کیمیست دینی

(سفر نامہ)

جگن ناتھ آزاد

مکتبہ جامعہ ملیٹری
کائنی دہلی



حدار دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیڈ، جامونگر، نئی دہلی 110025

شناخیں:

مکتبہ جامعہ لمیڈ، اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیڈ، پرسپکس بلڈنگ، بھبھی 400003

مکتبہ جامعہ لمیڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

قیمت = 45

تعداد 760

پہلی بار۔ نومبر ۱۹۸۶ء

لبرٹ آرٹ پرنس (پروپرائزر، مکتبہ جامعہ لمیڈ) پُروری ہاؤس، دہلی گنج، نئی دہلی ہے۔ اس طبع ہوئی

امریکہ دین اردو اور شرقی تہذیب کے عاشق

ڈاکٹر خورشید اے ملک

اور

ڈاکٹر محمد صسی اللہ خال

پائلرائیٹ دیسٹ یونیورسٹی شکاگو

کے نام

جن کے دعوت نامے یہ رے اس سفر کا سبب بنے

پہلا باب

۱۸ جموں سے دلبی
۱۹ چلی بھی جا جرسِ عینت کی صد اپنیں
۲۰ امریکہ میں پہلا دن
۲۱ اے گل پہ تو خُر سندم
۲۲ شکاگو میں مشاعرہ
۲۳ اقبال عالمی کانگرس، لاہور
۲۴ لائل پور کی یادیں
۲۵ میوزیم آف سائنس اینڈ انڈسٹری
۲۶ کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
۲۷ شکاگو کی ایک جھلک (۱)
۲۸ شکاگو کی ایک جھلک (۲)
۲۹ آئے ہیں سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
۳۰ شکاگو کی ایک جھلک (۳)
۳۱ پھر ایک دن آرام کا
۳۲ ڈاکٹر کلیم عاجز
۳۳ آرٹ انسٹی یوٹ آف شکاگو
۳۴ ڈاکٹر وحی الدخان کے ساتھ چند لمحے
۳۵ اسلامک سنٹر آف شکاگو
۳۶ ذکرِ اقبال

انڈیانا میں ایک دن
کشمیری کھانا اور کشمیری قہوہ

۶۸

۶۹

دوسرے باب

شکاگو سے ٹور ٹو

لیک انٹاریو تک

۷۲

۷۵

ترے جلوؤں کے آگے طاقت شرت و بیان رکھدی ۹۷

۸۳

۸۶

کرنل انور احمد

ٹور ٹو میں مشاعرہ

تیسرا باب

واپس امریکہ میں

پاکستان سے ہندستان تک

۸۶

۸۹

۹۳

۹۵

۹۶

۱۰۴

۱۰۵

۱۰۶

شکاگو پولی درستی لاہور بری

پھر نارتھ ایلنر انڈیائیونی درستی میں

شکاگو سے واشنگٹن

واشنگٹن میں پہلا دن

واشنگٹن میں مشاعرہ

درے گز رگیا ہے کوئی بن صدائیے ۱۰۶

زہرہ بیگاہ ۱۰۵

حیدر آباد ایسو سی ایشن ۱۰۹

فرودشم میں ۱۳۱

لندن کو واپسی ۱۳۳

بل بل سی لندن اور ۱۳۶

برمنگھم ڈیلی ویژن ۱۳۹

لندن سے روائی ۱۴۲

اپنے گھر میں ۱۴۲

نڈیارک

چوتھا باب

امریکہ سے روانگی

پھر لندن میں

III

۱۱۹

۱۲۳

حروف اول

یہ میرا دوسرا سفر نامہ کتابی صورت میں قارئین کے سامنے آ رہا ہے۔ پہلا سفر نامہ جزو بند
تھا دوسرے، غاباً ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بیس نے بھی اور سفر نامے لکھے ہیں
بعض مکمل ہو چکے ہیں اور بعض ابھی تک نامکمل ہیں۔ ان نامکمل سفر ناموں کی تعداد جو دہ بیس
پہنچتی ہے جن میں سے دس گیارہ تو سفر پاکستان ہی کے متعلق ہوں گے۔ پاکستان پہلی بار میں
۱۹۴۶ء میں گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء تک اتنی بار گیا کہ اب ہر سفر کی تفصیل بھی پیار نہیں یعنی
دفو تو یہاں بھی ہوا کہ ایک ایک سال میں دو دو یا تین تین بار مغربی اور مشرقی پاکستان کا
سفر ہوا۔ سال میں ایک بار تو قریب قریب معمول ہی رہا۔ لیکن ہوا یہ کہ میں نے سفر نامہ لکھنا شروع
کیا اور ہر بار نامکمل ہی رہ گیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں پاکستان میں اپنے احباب میں نجٹ
سے رات تک اس طرح گھر ارتھا ہوں کہ دن میں کچھ لکھنے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ جب
سفر کے بعد واپس آ جاتا ہوں تو دوسری مصروفیات اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں اور سفر نامہ چند
صفحات کے بعد نامکمل رہ جاتا ہے۔ ہر ہی کیفیت برما کے سفر میں ہوں جہاں میں حلقہ ام زکون
اور بزم شرعاً اردو زنگون کی دعوت پر گیا تھا۔ برما میں بھی تپاک کا دہی عالم تھا تو پاکستان
تھا اور جہاں تپاک کایہ زنگ ہو کہ ایک ایک شام کو تین تین جگہوں پر چاہے تو سفر نامہ
لکھنے کے لیے وقت کہاں سے آئے۔ تپاک میں بھی یہی کیفیت رہی اور مسجد و غرب امارات
میں بھی۔ مسجد و غرب امارات میں نقشائویہ تھا کہ اپنے میزبانوں مثلاً وسیم احمد و سیم، تجادر با بر
اور منظور شروت کے علاوہ دہاں مشاعروں میں شرکت کے لیے احمد ندیم قاسمی، قتیل شفاقی

محسن احسان، اقبال صفائی پوری اقبال عظیم، شاعر لکھنؤی، دلاور فگار، رحمان کیان، مظفروواریش راغب مراد آبادی، انجیاز رحمانی، کلیم عثمانی اور دوسرے احباب آئے ہوئے تھے۔ اب اس عالم میں جب کہ ایک ایک لمحہ خوش گپیوں میں اور یادوں کی براحت کی شرکت میں گزر رہا ہے سفرنامہ لکھنے کی فرصت کہاں سے ملے۔ ہاں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، اسپین، ڈنمارک، بلجم اور مہر کے سفر میں لکھنے کی فرصت بہت ملی اور میں نے سفرنامہ لکھنا شروع کیا۔ یہ سفرنامہ بڑی حد تک مکمل ہو گیا لیکن بعض اہم واقعات کی تفصیل محض اس یہی چھوڑ دی کہ ہندستان واپس جا کر لکھوں گا اور ہوایوں کہ ہندستان واپس ہونے کے بعد ان اور اراق کو ایک طرف رکھا تو یہ زیرِ طاقت نیاں ہی ہو گئے۔

لیکن روس کے سفر کی صورت حال مختلف رہی۔ سوویت رائٹرز یونین نے میرا پر ڈگرام اس طرح بنایا کہ ہر روز "آرام" کے نام پر مجھے دو ایک لمحہ مل جاتے تھے۔ میں یہ وقت سفرنامہ لکھنے میں صرف کرتا تھا۔ چنانچہ یہ روداد سفر روزانہ قلب بند ہوتی چلی گئی اور جب میں ما سکوتے جبوں روانہ ہوا تو قیام روس کے آخری دن کی رواداد لکھنا باقی تھی اور وہ میں نے طیارے میں لکھ لی۔ یہ سفرنامہ "پُشکن" کے دلیں میں "کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

زیرِ نظر سفرنامہ بھی قریب روز کارروز ہی لکھا گیا۔ یہ پر ڈگرام بھی شکا گو، واشنگٹن نیو یارک، نیو جرسنی، ٹورونٹو، لندن اور فرودشہم میں ایسا رہا کہ ہر روز لکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت ملتا رہا اور سفرنامہ ساتھ ہی ساتھ مکمل ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ جب میں لندن سے دہلی اور دہلی سے جبوں آیا تو صرف دو دن کی رواداد باقی تھی جو جبوں پہنچتے ہی میں نے لکھ لی۔

لیکن اسے صاف کرنے میں کوئی ڈیڑھ دو ماہ لگ گئے کیونکہ میری غیر حاضری میں میز پر کاغذوں کے انبار نہیں پہاڑ جمع ہو چکے تھے۔ ساری توجہ ان ہی کاغذوں کی طرف رہی اور صرف پچاکھیا وقت ہی اس سفرنامے کو صاف کرنے میں استعمال ہوتا رہا۔ بہر طور خدا خدا کر کے تین چار ماہ کی مدت میں یہ چند صفات صاف ہو گئے اور اب یہ سفرنامہ "کو لبس کے دلیں میں" قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

(۳)

مجھے امریکہ کے سفر کے لیے ڈاکٹر کلیم عاجز نے آمادہ کیا۔ ڈاکٹر خورشید ملک کی دعوت پر وہ امریکہ کے مشاعروں میں شریک ہو چکے تھے۔ اب کے پھر وہاں مشاعروں کا پروگرام طے ہوا تو ڈاکٹر کلیم عاجز نے میرے نام کی ہامی بھری۔ چنانچہ انہوں نے مجھے شنے سے پہنچ لکھا:

.....

پچھے احباب امریکہ میں ہیں۔ بازو ق اور اہل دل۔ شرو سخن سے اس سات
سمندر پار ملک میں بھی گہری دلپی اور علمی دلپی رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہی
احباب کے اصرار پر میں ۱۹۷۹ء میں امریکہ اور کینیڈا گیا تھا اور دسمبر میں
جب واپسی تھی تو ڈاکٹر احباب نے وعدہ لیا کہ اگلے سال بھی آؤ گے۔ ۱۹۸۰ء
میں تو موقع نہ ملا اس لیے کہ میں علیل ہو گیا۔ اس سال احباب کا پھر تقاضا
ہے اور یہ بھی تقاضا ہے کہ اس سال دو شانزہائیں اور انتخاب کا بوجھ مجھ پر
ڈال دیا ہے اگرچہ میں ہمیشہ اس سے گروہز کرتا ہوں۔ مگر انہوں نے سونی صد
بھی کو محیور کیا تو

ہزار مجمعِ خوبیں مایہر و ہو گا
نکاح جس پر نہر جائے گی وہ تو ہو گا

میں نے آپ ہی کو تجویز کیا اور سب نے یہ تجویز پسند کی۔ میرا ارادہ جوں میں
امریکہ جانے کا ہے۔ آپ اپنی رضامندی دے دیں تو ہم لوگ ساتھ چلیں
یا وہاں پہنچیں۔ آپ مجھے بھی لکھ سکتے ہیں اور میں پتا دے رہا ہوں۔ انھیں
بھی براہ راست لکھ سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے شکریے کے ساتھ یہ دعوت قبول کی اور اپنی رضامندی کی اطلاع پئنے میں ڈاکٹر کلیم عاجز کو اور امریکہ میں ڈاکٹر خورشید ملک کو دے دی۔ میرے خط کے جواب میں ڈاکٹر خورشید ملک نے لکھا ۔ ۔ ۔

آپ کا محبت نامہ ملا اور آپ کے والہانہ اور مخلصانہ ہذہ ب محبت و
التفاقات نے متاثر کیا۔ آپ کی آمد ہیاں اربی ذوق رکھنے والے تشریفیوں

کے لیے شادمانی کا باعث ہوگی۔ امریکہ جیسی سرزمین جو لطیف احساسات اور تہذیب اقدار سے بالکل ہی نا بلد اور غیر مانوس رہی ہے مشرق کے تہذیبیں پیام بر رہ اس کی حیات بے لطف و بے کیف کوئی زندگی بخش سکتے ہیں۔ مشاعروں کا انعقاد اشارۃ اللہ تعالیٰ مسیح کے آخر اور جون کے اوائل میں ہو گا.....

آپ نے دعوت نامہ قبول فرمائے عزت افزائی کی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر کلبر عاجز صاحب کی ہراہی سے آپ کا سفر پر لطف رہے گا۔ ساتھ ہی ایک خط اپنے پڑانے دوست پر دیسر اسد حسین کی طرف سے ملا جس میں انہوں نے لکھا:

..... غاباً آپ تو مجھے بھول ہی چکے ہوں گے۔ لیکن میں آپ کو کیوں کر بھول سکتا ہوں۔ خاص رُزپنہ کی ایک رات ۸ کے مصنف کو ایک پٹنے کا رہنے والا کیونکر بھول سکتا ہے۔

ایک مدت سے آپ کے ساتھ ملاقات نہیں ہوئے۔ غاباً بھولی مرتبہ ملاقات ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی۔ لندن میں ۰۰۰۰۰ میں ۱۹۴۸ء میں بھی ہندستان گیا تھا اور کوئی پچھے ہمیں وہاں قیام رہا لیکن آپ ان دنوں کشیریں تھے۔ شہباز اور حسن نعیم نے بتایا تھا یہ وہ دور تھا جب غلام سرور بہار کے وزیر تعلیمات تھے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔

آپ یقین مانیں کہ جب سے امریکہ میں ہوں آپ کو نہیں بھولا ہوں اور ہمیشہ ہی خیال رہا کہ کوئی ایسی صورت نکلے کہ آپ کو دہلی سے پہنچ آئے کی دعوت دینے کے بعد اب جمیں سے شکاؤ آنے کی دعوت دوں۔ خدا کے فضل سے وہ موقع ہاتھ آگیا ہے۔ گذشتہ ہفتے آپ کو EAST-WEST یونیورسٹی سے دعوت نامہ روانہ کر اچکا ہوں۔ مگر بھی ایک دو روز میں روانہ ہو جائے گا۔ یہ ساری باتیں تو افیشل طور پر ہوئی ہیں۔ اب میں ایک روست کی حیثیت سے دعوت دے رہا ہوں۔ اس مشاعرے کا انچارج میں ہی ہوں۔ اس حیثیت سے بھی دعوت دے رہا ہوں۔

کلمبک دیں میں

کلیم عاجز بھی انشا رالہ تشریف لائیں گے اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ شکا گوئیں بھی آپ کے شیدائی پٹنے سے کم نہیں ملیں گے۔ ڈاکٹر خورشید ملک نے آپ کو خط لکھا ہو گا۔ یہ سارے اپنے ہی بوج ہیں۔ اب آپ مہربانی کر کے جلد از جلد تشریف لے آئیں۔ ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ آپ یہاں ہم، اگست تک ہزار پہنچ جائیں اس لیے کہ یہاں ۵، ۶ اگست کی شام کو ایک خاص جلسہ ہے جس میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ درس و تدریس کی دنیا میں آگئے ہیں۔ میں بھی شکا گوئی ایک یونیورسٹی میں پڑھارتا ہوں لیکن اردو نہیں بلکہ سیاسیات کا موضوع پسند کیا ہے۔

اب آپ سے ملنے کے لیے طبیعت بے چین ہے۔ دیر نہ کریں۔ جلد آجائیں۔ غالباً آپ کا اور کلیم صاحب کا قیام میرے ہی غریب خانے پر ہو گا۔ ابھی طے نہیں ہوا ہے لیکن میری تو یہی خواہش ہو گی۔

اس خط کا امیدافزا جواب جلد از جلد دیں تاکہ ہم سب کو اطمینان ہو کہ آپ وقت پر پہنچ رہے ہیں۔

اسی طرح خط دکتا بات میں کچھ وقت گزر گیا اور زائرخوں کا تعین ہوتا رہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر کلیم عاجز کے ساتھ پڑنے، دہلی، کراچی اور متحده عرب امارات (ابوظہبی، دوبی اور شارجه) کے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ دوسری میں تو ہم دونوں کا قیام ایک ہی ہو گیل میں تھا کیونکہ دونوں کو ایک، یہ جماعت، بزم ادب الامارات، نے مدعو کیا تھا اور انہیں تحریر ادب کراچی، کے مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی سے کراچی تک کا سفر ہم نے اکٹھا ایک ہی طیارے میں کیا۔

متحده عرب امارات سے جب میں بھوں واپس لوٹا تو ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر وحی اللہ خاں کی طرف سے یہ دعوت نامہ ملا:

Professor Jagan Nath Azad,
Head of the Department of Urdu,
Dean, Faculty of Oriental Learning,
Jammu University,
Jammu, J & K.

Dear Prof. Azad.

I have the honor to invite you to a conference being held at this University during the current Summer session ending September 20, 1981. This conference, as you already know will focus on the issues and concerns of Third World countries.

Your visit is officially sponsored by this University in terms of related expenses to be incurred for this purpose. Please show this letter in order to obtain necessary travel documents. The sooner you could reach here, the more we will be able to benefit from your expertise.

With warmest personal regards

Sincerely,

Dr. M. Wasi Khan,
Chancellor

اس کے چند روز بعد جموں سے شکاگو اور شکاگو سے جموں تک کا ملکت آگیا۔ اس کی اطلاع میں نے ڈاکٹر کلیم عاجز کو تار کے ذریعے سے دی۔ وہ ایک خط بھی لکھے کہ روانگی کی تاریخ میں سیکن، تھوڑے دس دن گزرنے پر بھی ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو میں نے سمجھا کہ وہ شاید وہ امر پکر روانہ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مزید انتظار کیے بغیر میں نے بھی رخت سفر باندھا اور جموں سے دہلی، دہلی سے لندن اور لندن سے نیو یارک ہوتا ہوا شکاگو پہنچنے کیا۔

یہاں پہنچ کے جب یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کلیم عاجز ابھی تک امریکہ نہیں پہنچنے تو اپنی عجلہ بازی پر بہت افسوس ہوا۔ میں تو اس خیال میں تھا کہ شکاگو پہنچتے ہی ان کے جھیکڑا کروں گا کہ آپ نہیں بتائے بغیر کیسے روانہ ہوئے میکن یہاں پہنچ کر صورت یہ تھی کہ میں ازرام ان کو دیتا تھا قصوراً پنا نکل آیا

اب ان کا انتظار شروع ہوا۔ ایک دن نسبی سے ان کا ٹیلی فون شکا گو آیا کہ ایرانڈیا کے طیارے میں جگہ نہیں مل رہی ہے۔ لیکن انہوں نے کوستش کر کے کسی اور طیارے میں ریزروشن کرالی اور اس اگست کو شکا گو پہنچ گئے۔

آن کے پہنچنے پر مجھے دن رات کا رفیق سفر مل گیا۔ بقول اقبال سے

من از طریق نہ گویم رفیق می جو یم
کگفتہ اندخختن رفیق و بعد طریق

یوں تو ڈاکٹر خورشید ملک کے یہاں جہاں میں مقیم تھا مجھے کسی قسم کی تنہائی کا احساس نہیں تھا کیونکہ خورشید ملک . . . ، ان کی سکیم اور آن کے بھتیجے خیالیں ملک نے اول سے آخر تک میرے ارام و آسایش کا اس قدر خیال رکھا کہ شاید شکوئے کے الفاظ میرے دلی جذبات کا ساتھ نہ دے سکیں۔ آن کے پچھے تنویر، نوید اور زخمی زیبا کی موجودگی میں مجھے کبھی تنہائی کا احساس ہی نہ ہوا لیکن کلیم عاجز کے آنے کے بعد بات چیت کا ایک درد ازہ اور کھل گیا اگرچہ ڈاکٹر کلیم عاجز بھی ڈاکٹر کلیم الدین احمد کی طرح کم سخن واقع ہوئے ہیں۔

(۳)

مغرب کی طرف یہ میرا پہلا سفر تھا اور اگران میں پاکستان کے سفر بھی شامل کروں کیونکہ پاکستان بھی ہندستان کے مغرب ہی میں ہے تو پھر ان سفروں کی تعداد بتانا میرے یہ مشکل ہو جائے گا لیکن امر یکدی اُنے کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا اور اس سرزی میں پر پانوڑ رکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ واقعی ایک نئی دنیا میں آگیا ہوں۔

میں امر یکدی میں قیام کے دوران میں یہاں کے مناظر سے بھی متاثر ہوا۔ جن میں جنگل دریا، پہاڑ، جھیلیں سب شامل ہیں، سائنس اور ٹکنالوجی کے کارناموں سے بھی جن میں پیشہ گرم بھی شامل ہے سیرز ٹاؤر بھی اور چاند سے واپس آئے ہوئے کیپوں بھی۔ دستِ انسانی اور ذہن انسانی کے کرشوں ہی کی طرح دلکش و دلچسپ یہاں ایک اور دنیا بھی آباد ہے اور وہ ہے عجائب خانوں کی دنیا اور یہ دنیا پرانی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے ساتھ اس نئی دنیا سے وابستگی اور دلستگی کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔ ساتھ ہی

کو لمبیں کے دلیں میں

ساتھ میری توجہ کا مرکز ہونی ورثیاں بھی رہیں اگرچہ ان میں سے بیشتر بند ہی تھیں (تعطیلات موسم گرم کے باعث) اور ان کے بند ہونے کی وجہ سے اکثر ان دوستوں اور احباب کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکی جو ان درستگا ہوں میں تعلیم دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود درس و تدریس کی اس دنیا کی ایک جھلک میں نے اپنے دوران قیام میں دیکھو۔

اس سفر میں امریکہ کے علاوہ کینیڈا اور واپسی پر برطانیہ جانے کا بھی اتفاق ہوا چنانچہ اس سفر نامے میں جو بنیادی طور پر سفر امریکہ ہی کی رواداد سنانے کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ قارئین کو کینیڈا اور برطانیہ کے سفر کی بھی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئے گی۔ مجھے اس سفر کے بارے میں صرف یہی کہنا ہے کہ

اگر بدل نہ خلدہ ہر کہ از نظر گز رد
خوشار وانی عمرے کو در سفر گز رد

امریکہ کی طرح کینیڈا اور برطانیہ میں بھی ہندستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک بھاری تعداد موجود ہے۔ ان دونوں جگہوں پر کئی پڑا نے دوستوں سے ملاقات ہوئی اور کئی نئی دوستیوں کی بنیاد پڑی۔ قتيل شفائي، جميل الدین عالي، ضمیر جعفری، حمایت علی شاعر، صہبا اختر اور پروین نفاست کے ساتھ امریکہ میں ملاقات صبح معنی میں ایک

PLEASANT - تھی۔ افتخار نیم، ابجائز نسرين اور نیم سرور کے ساتھ ملاقات بھی PLEASANT - SURPRISE

سے کم نہیں تھی۔ افتخار نیم اور ابجائز نسرين میرے مرحوم دوست خلائق فرشی کے بیٹے اور بیٹی ہیں اور نیم سرور ان کے داماد امیرے ایک اور مرحوم دوست رمضان سرور کے فرزند۔ ابجائز نسرين کے بارے میں مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ امریکہ میں ہیں لیکن یہ یاد نہیں رہا تھا کہ شکا گو ہیں ہیں۔ افتخار نیم اور نیم سرور کے متعلق اتنا بھی معلوم نہیں تھا۔ برطانیہ میں جميل الدین عالی کے ساتھ شکا گو کی ملاقات کے چند روز بعد پھر ملاقات ہوئی۔ آں حسن کوئی تین برس قبل سری نگر آئے تھے۔ اس کے بعد اب ان سے ملاقات ہو رہی تھیں۔ اسی طرح وقار احمد سے کوئی چار برس بعد اور یا اور عباس سے دس گیارہ برس بعد ملتا ہو رہا تھا۔ زہرہ نگاہ سے کوئی پانچ سالات ماہ بعد ملنے کا اتفاق ہوا۔

ابنی بیٹی پر ملا سے ملاقات کئی برس بعد ہوئی اور براور نسبتی سمجھا شک کے ساتھ لندن میں ایک بار پھر قیام کا موقع ملا۔ اور یہ ڈیڑھ صد دن ماہ کی مدت پل جھپکنے میں گزر گئی۔

زشیشہ ناہ قدر تختم بہارگزشت

(۳)

اگرچہ سہرستان کی زبانوں میں اردو اور شاعروں میں اقبال کی مختلف ملکوں میں مقبولیت سے میں بے گاہ نہیں تھا اور دوسرے ملکوں میں میرے سفر کی بنا ہمیشہ اردو اور اقبالیات ہی رہی ہے — نیپال، برما پاکستان، متحده عرب امارات، یورپ، برطانیہ، روس دیگرے — لیکن امریکہ اور یمنیہ ایں اردو اور اقبال کی مقبولیت کی جو کیفیت دیکھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ امریکہ کی متعدد لوگیں درستیوں کے اساتذہ اور طلبہ اور یونیورسٹیوں سے باہر علم و ادب سے ذوق رکھنے والے دانش و رحیڑات اور بالخصوص نئی نسل کے لوگ اقبال کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانتے کے ارز و مند ہیں اور سہرستان اور پاکستان کی اقبال کے نام پر قائم کی ہوئیں الگنیں ہیں اور اس سلسلے میں کام کر رہی ہیں اقبال کے متعلق جانتے کی نشانگی باہر کے ملکوں میں کس قدر زیادہ ہے اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔

امریکہ اور یمنیہ ایک تین یونیورسٹیوں میں میرے پیکھر ہوئے۔ دو تو براہ راست اقبال ہی کے فکر و فن سے متعلق تھے اور تمیبر اگرچہ اہل دین لٹریچر کے موضوع پر تھا لیکن اس کی تابع بھی اقبال ہی کے فکر و فن پر اکٹھوتی تھی۔ بھی محفوظوں میں شعری نشستوں سے قبل موضوعِ گفتگو بالعموم اردو ادب رہتا تھا یا اقبالیات۔

لے ان تمام ملکوں کی سیاحت کا سبب اردو اور اقبال ہی تھا اور شاید یہ اسی لیے
EDUCATIONAL NEWS AND VIEWS

Professor Azad A.G. to be Troller

He flies with the wings provided by Iqbal

مجھے آج کو کیشنل نیڈر اینڈ ویدر کا یہ فقرہ بہت پسند آیا تھا — بقول شاعر
گرچہ خود یہ نسبتے است بریڈل ذرہ آفتاب تباہیم

عشقِ شور انگریز را ہر جا رہ در کوئے تو بُرد
بر تلاشِ خود چھمی نازد کر رہ سوئے تو بُرد

امریکہ کینیڈا اور برطانیہ میں ہندستانیوں اور پاکستانیوں کے باہمی میل ملا پڑنے کی بھی
مجھے بے حد مبتائز کیا۔ وہاں اردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت میں دونوں کی مسامعی جمیلہ
شامل ہیں۔ امریکہ کی بائیس تیسیس یونیورسٹیوں میں اردو بہنسی اور دوسری ہندستانی اور
پاکستانی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یونیورسٹیوں سے باہر انگریز اردو اور انگریز اردو
کینیڈا و فعال جماعتیں ہیں۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ انگریز اردو کینیڈا مقابلہ بتائیا وہ فعال جماعت
ہے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ اس جماعت کی پشت پر متعدد اہل قلم اور مخالف کارکنوں کی ایک جماعت
کا خلوص ہے اور انگریز اردو اور امریکہ کا سارا بوجھ ایک مرد و رواحد احمد خاں کے لئے ہوں ہے۔
اب ضرورت اس بات کی ہے کہ امریکہ کے خادمان اردو، اہل قلم اور دانش در احمد خاں کے
ساتھ پورا تعاون کرے۔ بلکہ احمد خاں خود اس انگریز کو تعلیم کا رنگ دیں تاکہ یہ اردو داں
بلقے کے لیے اور زیادہ مفید ثابت ہو سکے اور اس وقت امریکہ میں اردو کے ادبی حلبوں
اور مشاعروں کے لیے جو فضایا پیدا ہو رہی ہے اس کی بدولت کچھ مدت بعد اردو ادب میں
ایک نئے باب کا اضافہ ہو سکے۔ امریکہ اور کینیڈا میں نئے شاعروں کی آٹھان کو دیکھتے
ہوئے اس خواب کے شرمندہ تعمیر ہونے کی پوری توقع کی جا سکتی ہے۔ ضرورت صرف اس
بات کی ہے کہ امریکہ اور کینیڈا میں اردو کے اہل قلم کی نئی نسل اپنے اس فرض سے غافل
نہ ہونے پائے۔

ایک چھوٹی سی بات اور۔ اردو کے لیے کام امریکہ کینیڈا کی یونیورسٹیوں میں
بھی ہمارا ہے اور یونیورسٹیوں سے باہر بھی سیکن یونیورسٹیوں اور باہر کے علمی اور
ادبی اداروں کا اپس میں غائبًا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے کام
سے بے خری پنے الگ الگ حلقوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کو اب ختم ہونا
چاہیے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ دانش گاہیں اور دانش گاہوں سے باہر کے علمی اور ادبی
ادارے اپنی الگ الگ جیشیں برقرار رکھتے ہوئے باہمی تعاون سے اپنے پر دگرام بنائیں
اور انھیں عملی جامہ پہنایں۔ ممکن ہے اس طرح کی اجتماعی کوششوں سے بہتر نتائج
ظہور پذیر ہوں۔

کو لمبیں کے دلیں میں

بیری بعض اور تصانیف کی طرح یہ سفرنامہ بھی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کی جانب سے
شائع ہو رہا ہے۔ یہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور اس کے حزل منجھر عزیز محترم شاہد علی خاں
کا منون ہوں۔

جگن نا تھو آزاد

شعبہ اردو

جموں پولن درستی جموں

۵ جنوری ۱۹۸۲ء

پہلا باب

(1)

جموں سے دہلی

میں ہندستان کے ایک گوشے جموں میں ہوں اور میرا سفر ملکی یا غیر ملکی، اسی جمود سے شروع ہوتا ہے۔

اب کے امریکہ کا سفر بھی جموں ہی سے شروع ہوا۔ میں ۷ اگست کی دو پہر کو دہلی پہنچا۔ اُس وقت تک نہ میرا دیزہ بنا تھا اور نہ اسی طیارے کی ریز روشنی ہوئی تھی۔ دونوں کام ۸ ابھی کو مکمل ہوئے۔ امریکی سفارت خانے کی کارگزاری دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ کارگزاری کا۔ ہی اعلاء معيار مجھے روس جاتے وقت نئی دہلی کے روئی سفارت خانے میں نظر آیا تھا۔ صبح نو بجے میں نے دیزا کے بیٹے درخواست دی۔ دس بجے مجھے بتایا گیا کہ شام کو سازھے چار بجے دیزا مل جائے گا اور میں جب ساڑھے چار بجے امریکی سفارت خانے میں پہنچا تو دیزا تیار تھا۔ ودلے کے میں ایرانڈیا کے دفتر میں آیا۔ اس وقت پانچ بجے تھے اور مجھے امید کچھ کم تھی کہ دہلی سے نیو یارک اور نیو یارک سے شکا گوتک کی ریز روشنی ہو جائے گی لیکن ایرانڈیانے پورا تواون کیا اور اپنے طیارے میں دہلی سے براہ راست نیو یارک تک کی ریز روشنی دے دی اور ٹرانس ورلڈ ایر دیز کے طیارے میں نیو یارک سے شکا گوتک کی۔ اس سفر میں میری پہلی منزل شکا گوتک ہی تھی جہاں سے ڈاکٹر خورشید ملک اور پروفیسر اسد حسین نے امریکہ اور

کینڈرا کے مشاہروں میں شرکت کی دعوت دی تھی اور ڈاکٹر محمد وصی اللہ خاں چانسلر ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکا گئے ایک کانفرنس کے لیے یاد فرمایا تھا۔

(۳)

چلی بھی جا جس غنچے کی صد اپنے یہم

پالم کے فضائی مستقر پر حاضری کا وقت دو بنجے صبح کو تھا۔ ۱۹ اگست کو۔ اور طیارے کی پرہ واز کا وقت چار بنے صبح تھا میں نے سوچا جب دو بنجے پالم پریخنا ہے تو اپنی قیام گاہ جبوں و کشمیر کو رمنٹ گیٹ ہاؤس سے صبح کو ایک بنے چلنا ہو گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رات کو گیارہ بارہ بنجے تیاری شروع کر دینا ہو گا۔ گویا اس رات کی نیند غائب۔ یعنی ملکی سفر میں بالعموم یہ پہلی مشقّت، ہوتی ہے جو مجھے جھیلنا پڑتی ہے۔ اس بار بھی درہی سے سفر کی ابتدا اس مشقّت سے ہوئی اس خیال کے پیش نظر کہ جب یہ رات آنکھوں ہی میں کاٹتا ہے تو کیوں نہ کھانا کھانے کے بعد سیدھا پالم ہی کا رُخ کیا جائے۔ اس خیال کی عملی صورت یہ ہوئی کہ میں کوئی دس بنج نک پالم پریخن گیا۔ طیارہ صبح کو سازھے پاپنچ بنے چلا۔ رات میرے سامنے صبح میں تبدیل ہو گئی۔ سیکن کسی حد تک اطمینان بخش بات یہ ہوئی کہ طیارے کے روانہ ہوتے ہی مجھے نیند آگئی اور میں کوئی ادھ کھنٹ کے قریب سولیا۔ آنکھ کھلی تو طیارے کا رُخ دیار محبوب یعنی پاکستان کی جانب تھا۔ بہت جی چاہا کہ کھڑکی میں سے جھانکوں اور جو کچھ بھی نظر آئے اُسے غنیمت جانوں میں رات بھر جائے کے باعث بدن ٹوٹ رہا تھا اور انہیں سُکت نہیں تھی کہ کھڑکی پر نظر جما کے بیٹھوں۔ اپنی نشست پر ڈھیر ہوئے پڑا رہا۔

پاکستان کے اوپر گزرنے کے بعد طیارے نے متحده عرب امارات کا رُخ کیا اور دو ماں سے کوئی نہ کا۔ کویت میں طیارہ کوئی ایک گھنٹہ کے لیے رکا۔ یہاں طیارے کا پہلا عملہ رخصت ہوا اور دوسرے عملہ نے اس کی جگہ لی۔ ہم لوگوں کو طیارے سے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی میکن دروازہ چونکہ گھلایا تھا میں نے اُسی میں کھڑے ہو کر اس کا لے سونے کے مذک کی ایک جعبدک

دیکھی۔ کویت کا شہر ذرا فاصلے پر تھا اور اس کی جدید ترین طرز کی بنی ہوئی سربالدک عمارتیں اس کی ثروت کی رواد سنار ہی تھیں۔ مگر بزرے کا دور دوڑتک نشان نہیں تھا۔ مگر تاحد نگاہ پھیلا، ہوار یگستان اور اس میں ریت کے چھوٹے بڑے ٹیکے مجھے اپنے پچپن کی یاد دلار ہے تھے کہ میرا پچپن بھی جس علاقے میں گزراتھا وہ ایسا ہی ریگستان تھا اور ایسے ہی چھوٹے بڑے ٹیکوں سے آباد تھا۔

چونکہ میرا سفر مشرق سے مغرب کو تھا اس لیے قدم قدم پر گھری کی سوتیوں کو تیکھے کرنا پڑتا تھا اور اس طرح جب کویت پہنچنے تو وہاں صبح طلوع ہو رہی تھی اور بال جبریل کا یہ منظر آنکھوں کے سامنے تھا

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں

چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں روائیں

یہاں ایک گھنٹہ گزر ہو گا کہ طیارے نے پھر اڑان بھری اور نُر کی، رومانیہ، یوگو سلاویہ، مغربی جرمنی، بلجیم اور اُبناۓ انگلستان کی سرحدیں عبور کرتا ہوا برطانیہ کے پایا یہ تخت لندن کی فضاؤں میں داخل ہو گیا۔ انسان کی وہی مہروف زندگی، وہی شرکیں تھیں۔ وہی عمارتیں وہی میدان اور وہی سبزہ زار جو اج سے اٹھا رہ برس قبل میں بڑی تفصیل سے دیکھو چکا تھا میکن اب ان میں مجھے وہ حسن نظر نہ آیا جو ۱۹۴۲ء میں نظر آیا تھا۔ میرے استاد شمس العلما مولانا تا جو رنجیب ابادی نے ایک بار کہا تھا کہ لذت ہانے میں نہیں ہوتی بھوک میں ہوتی ہے۔ اسی اصول کا اطلاق پنے اور لندن کے تعلق پر کرتا ہوں تو بات یوں سمجھو میں اُتنی ہے کہ لندن اُج بھی ویسا خوبصورت ہو گا جب ۱۹۴۳ء میں تھا۔ میری نگاہیں شاید حسن آشنا نہ رہی ہوں کیونکہ لندن ہو یا پرس، اُملی ہو یا امر یکہ یہ ایسی جگہیں نہیں ہیں کہ جوانی گزرنے کے بعد انھیں دیکھا جائے۔

میکن میں عہر حاضر کی جنت ارضی امریکہ کو دیکھنے غر کے اسی حصے میں جا رہا تھا۔ بہروری اپنے پر پھیلائے لندن کے فضائی مستقر پر آتے۔ مسافروں کو یہاں طیارے سے باہر آنے کی اجازت تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ، میکن یہ بھی بتایا گیا کہ امریکہ کے فضائی مستقدروں پر چونکہ عملہ کے ایک حصے نے ہر ہائل کر رکھی ہے اس لیے ایرانڈیا کے طیارے کے نیو یارک میں اُترنے کا انتظام کیسیڈی ایرپورٹ کے حکام شام کے ساتھ چھبھے سے ہے۔ میکن نہیں

کر سکیں گے۔ گواہ مارے طیارے کو جسے لندن میں ایک گھنٹہ تک نا تھا اب ساڑھے تین گھنٹے رکنا پڑا۔ میری بیٹی پر ملا، اس کا شوہر اور بیٹھتی سمجھا ش اپنے یہودی بچوں سماں سے ہیں انگلستان میں مقیم ہیں۔ ان کے ٹیکلی فون نمبر کیس کاغذوں میں تھے جو تھیرڈ ائر پورٹ پر اترنے وقت جلدی میں مجھے نہ مل سکے۔ درجنہ ان کے ساتھ بات ہو جاتی۔ دیسے والی پر انگلستان میں رکنے اور ان کے ساتھ قیام کا پروگرام تو ہے ہی۔

یہ ساڑھے تین گھنٹے ذضائقی مستقر کی مڑکشت ہی میں گزرا ہے۔ ڈیوبی فری شاپ کا ایک جائزہ سایا۔ شراب اور سگریٹ کے سوا ہر چیز اسی گراں نظر آئی۔ چارس اور ڈائنس کی شادی کو ایک انگلستان نے ایک تجارت بنالیا ہے۔ ان کی تصویر میں قریب قریب ہر فروختی شے پر موجود تھیں۔ گنجیوں کی ایک زنجیر پر ان دونوں کی تصویر میں تھیں۔ شاید اسی وجہ سے اس زنجیر کی قیمت سانچھروپے تھی۔ دیسے بھی ہر شے بہت گراں تھی اس لیے محض جائزہ یعنی کے سوا اور کچھ اپنے بس میں نہ تھا۔ گویا بازار سے گزرنا ہوں خریداں نہیں ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن چیزوں کو میں گراں سانچھ رہا ہوں وہ لندن اور اہل لندن کے معیار کے مطابق نہیں ہوں۔

اس وقت تک میں تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ خدا خدا کر کے طیارہ ساڑھے تین بچے چلا اوڑھا ویاناوس کو عبور کرتا ہوا ساڑھے بچے نیو یارک کے ہواں اڈتے، بیسینڈی ایرپورٹ پر اڑتا۔ کشم وغیرہ سے فارغ ہوا تو سات بچے ہلکے تھے اور ڈرانس درلڈ ایر ویز کا طیارہ جس سے بچے شکا گور وانہ ہونا تھا جاپکا تھا چنانچہ ایرانڈیا کے مقامی امریکی نمائندے نے بچے یونا یئسٹڈ ایر لائنز کے طیارے میں ریز رویشن کر دی۔ اس طیارے کی روائی کا وقت شام کے ساڑھے نوبجھ تھا۔

عام سماجی زندگی میں علم کی قدر ماسکو کے علاوہ نیو یارک میں دیکھی۔ میں اپنی باری پر امیگریشن آفیسر کی میز کے قریب پہنچا تو اس نے میرے ہاتھ سے متعلقہ کاغذات لیتے ہوئے مجھ سے امریکہ آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے بتا پا کہ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکا گوکی دعوت پر آیا ہوں۔ ایک کافرنش میں شرپک ہونا ہے۔ لیکچر دینا میں اور مشاعروں میں شرکت کرنی ہے۔ اس دوران میں وہ میرے پاپورٹ دیزرا پر بھی نظر ڈال چکا تھا۔ اب اس نے ہرف اتنا ہی پوچھا آپ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں؟ میرے جی ہاں کہنے پر اس نے

کو میں کے دلیں میں

جواب میں خوش آمدید کہا اور سوال کیا کہ مجھے کتنا ویزادر کار ہے۔ میں نے کہا یونیورسٹی سے میں نے کُل چھٹی ایک ماہ کی لی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ تو نہیں ہر سکون گا۔ اُس نے ویز اکے کالم میں دو ماہ کا اندر اج کر دیا۔ دو قدم آگے کشمکش کی منزل تھی۔ وہاں بھی حسن سلوک کی یہی تصویر دیکھنے میں آئی۔

مجھے کچھ فیال تھا کہ شاید میرے خطوط شکا گویں میرے میزبانوں تک نہ پہنچے ہوں اور ہو سکتا ہے شکا گوایر پورٹ پر کوئی دوست موجود نہ ہو اس لیے میں نے اختیاط۔ لیکن وہ میں پروفیسر اسد حسین کو ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر خورشید مدنگ کو اطلاع دی۔ چنانچہ رات گیارہ بجے... جب یوناٹس ڈاکٹر لائز کا طیارہ مجھے لے کر شکا گوپہنچا تو ایر پورٹ پر ڈاکٹر خورشید مدنگ اپنے بھتیجے ضیا مدنگ کے ہمراہ موجود تھے۔ وہاں سے وہ مجھے اپنے ساتھ ایسکس ہوٹل میں لائے اور میں کمرہ نمبر ۱۰۱۲ میں فروکش ہو گیا۔

گھری کے حساب سے تو اس سفر میں انٹھارہ گھنٹے ہرف ہوئے تھے کہ میں صبح ساڑھے پانچ بجے دہلی سے چل کر رات کے گیارہ بجے شکا گوپہنچا کیا تھا لیکن یہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گھری کی سویبوں کو بچھے کرنے کا کرشمہ تھا۔ دراصل دیکھا جائے تو یہ سارا سفر قریب قریب اُتیس یا اُتیس گھنٹوں کا تھا۔ اور اُتیس یا اُتیس گھنٹے طیارے میں اپنی کرسی پر بیٹھا رہنا ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔ یہاں ایک حد تک الہیمان بخش بات یہ تھی کہ کسی کسی وقت جیکی اجائی تھی جس سے طبیعت تھوڑی دیر کے لیے بحال ہو جاتی تھی۔

(۳)

امریکہ میں پہلادن

اگرچہ ہم لوگ رات کے بارہ بجے تک ہوٹل میں پہنچ گئے تھے لیکن مجھے سوتے سوتے ڈیڑھونچ کیا۔ صبح آٹھ بجے ناشستے سے فارغ ہو کے چھل قدمی کو نکلا۔ سڑکوں پر خوبصورت

چہروں کا ازدحام تھا۔ سامنے ٹرک کے پار ایک نہایت عمدہ پارک تھا جو مشیگن جھیل کے کنارے میلوں تک چلا گیا تھا۔ اس پارک میں جھیل کے کنارے سیکڑوں بلکہ ہزاروں مردوں نے غسل افتادی لے رہے تھے۔ بعض جھیل میں نہار ہے تھے۔ میں کوئی ایک گھنٹے تک یہ منظر دیکھتا رہا میکن ایک گھنٹے کی سیر کے بعد پھر یہ احساس ہوا کہ یہ حسین چہرے اور حسین مناظر دل پر اب وہ انثر نہیں کر رہے ہیں جو بہلے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کمرے میں واپس آکے جماؤں، سری نگر اور لندن اپنے گھر کے لوگوں کو خطوط لکھنا شروع کیے۔ اسی دوران میں ٹیلی فون کی گھنٹی بیکی۔ یہ ایسٹ ویسٹ کے چانسلر ڈاکٹر وصی اللہ خاں کا ٹیلی فون تھا۔ وہ مجھ سے ملنے تشریف لارہے تھے اور اس کی اطلاع انہوں نے ٹیلی فون پر دی۔ کوئی دس بجے کے قریب وہ تشریف لائے۔ بڑے نیاک سے ملے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان کے ساتھ دین اوف ایڈمک آفیسرز مسز مدھو جیں بھی تھیں۔ ڈاکٹر وصی اللہ خاں اور ڈاکٹر مدھو جیں نے اس یونیورسٹی کو بنانے اور اسے موجودہ معیار نک پہنچانا نے میں بڑا کام کیا ہے۔

اسی بات چیت کے دوران میں ڈاکٹر وصی اللہ خاں نے دن کے کھانے کی دعوت دی۔ چنانچہ اسی ہوٹل کے ڈائیننگ روم میں ہم لوگ کھانے کے لیے پہنچے۔ ابھی ہم کھانا کھا جی رہے تھے کہ اسد حسین اپنے تین دوستوں کے ہمراہ دہاں آتکے۔ یہ تین حضرات تھے۔ سید سلمان ندوی دیوبندی ندوی مرحوم کے فرزند، ڈاکٹر ما مس بیلنٹائن ارونگ اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی۔

سید سلمان ندوی ڈینا ویسٹ دے یونیورسٹی نیال میں پروفیسر اف اسلامک اشٹڈیز ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اب عنقریب ان کا انقرار ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکا گویں ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر ارونگ ہسپانوی اور عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی اف پیشیسی سے ریٹائر ہوئے ہیں اور اب شکا گویں بیٹھ کے اطمینان کے ساتھ اسلامیات پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نجات اللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ دینیات کے صدر رہ چکے ہیں۔ اس وقت کنگ عبد العزیز یونیورسٹی جدہ میں ہیں اور ان دونوں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکا گویں وزٹنگ پروفیسر کے طور پر آئے ہوئے ہیں۔ ہاں پر تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ پروفیسر اسد حسین جو نار تھا اپرشن یونیورسٹی میں پوشیکل سائنس کے پروفیسر

ہیں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں واپس چانسلر ہیں۔

کھانے پسے فارغ ہو کے سید سلمان ندوی، ڈاکٹر ارونگ، ڈاکٹر نجات اللہ، پروفیسر اسد حسین اور راقم الحروف ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں پہنچے۔ باقی حضرات تو چونکہ پہلے ہی سے اس یونیورسٹی کے ساتھ کسی نہ کسی طرح والبستہ ہیں اس لیے یونیورسٹی اور اس کے کام کو بخوبی جانتے تھے۔ میرے لیے یہ یونیورسٹی نئی تھی چنانچہ چانسلر ڈاکٹر وصی اللہ خاں نے اس یونیورسٹی کا گوشہ گوشہ دکھایا اور اس کے کاموں سے آشنا کیا۔

ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکا گواہی کی جدید ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے۔

مشیگن ایونو میں واقع یہ چار منزلوں پر مشتمل یونیورسٹی مختلف قوموں اور مختلف ملکوں میں ایک پل کا کام دے رہی ہے بالخصوص مشرق اور مغرب کے درمیان یہ ایک رابطے کی کڑی ہے۔

اس یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہی ہر طالب علم کو ایک ایڈواائز رہیا کر دیا جاتا ہے۔ ایڈواائز اور کونسلٹر طالب علم کو صرف کالج کی زندگی برپ کرنے کے ادب ہی نہیں سکھاتا بلکہ اس کے مستقبل کے متعلق بھی اسے مشورہ دیتا ہے۔ اس یونیورسٹی میں درس و تدریس کے مظاہر میں یہ ہیں:

برل ارٹس اینڈ سائنسز، باولاجیکل سائنسز، کیمسٹری، انگلش اینڈ کیمپنیکیشنز، ہسٹری، سینٹھمیٹکس، فزکس، پولیٹیکل سائنس، سائیکلوجی، شوشاںیا لوچی، سٹیمیٹک، ہیومنزرم۔

انجینئرنگ میکنالوجی:

کپیوٹر سروس ٹینکنالوجی، ڈیٹا پرائینگ اینڈ سسٹم انیلیزیز، ایکٹرانک انجینئرنگ ٹینکنالوجی، انجینئرنگ ڈرائیک، انڈسٹریل انجینئرنگ۔

بزنس اینڈ مینیجنمنٹ:

اکادنگ، اکنامیکس، فائنس، مینیجنمنٹ سائنس، پبلک ایڈمنیشن، سیکریٹریل سروس اینڈ آفس ایڈمنیشن۔

اس یونیورسٹی میں ایک شعبہ کے نام سے قائم ہے۔

اس میں ان طلبہ کو انگریزی پڑھانے کا بھی انتظام ہے جو انگریزی اچھی نہیں جانتے۔ اب اس بات کی کوشش بھی ہورہی ہے کہ ایک شعبۂ اردو بھی قائم کیا جائے۔

آج ہمارا وہ کاغذ منعقد ہوئی جس میں شرکت کی دعوت پر یہاں پہنچا ہوں۔ عنوان تھا "تیسری دنیا اور اس کے مسائل"۔ اس میں ہندستان کے علاوہ مشرق وسطی اور جنوبی افریقہ سے بھی مندرجہ میں شریک ہوئے۔

یہ امریکہ کی پہلی یونیورسٹی تھی جو میں نے دیکھی۔ اس کے فوراً بعد میری دوسری منزل ناہر تھوڑی سی یونیورسٹی تھی۔ اسد حسین اسی یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کے پروفیسر ہیں۔ تیس سال قبل اسد حسین سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پہنچنے میں۔ اس زمانے میں وہ بزم ادب پہنچنے کے صدر یا سکریٹری تھے۔ "سنگم" کے مدیر غلام سرور کے دوستوں میں ہیں۔ ان دونوں کرم فرماؤں نے مجھے بزم ادب کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تھی یہ ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے کچھ مدت بعد اسد حسین ہسپلار تعییم امریکہ آگئے اور کئی برس بعد ان سے میری ملاقات لندن میں ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں سر را ہے ملاقات ہوئی لیکن اس کے بعد تین چار روز ہم نے اکٹھتے بھر کیے۔ ۱۹۴۲ء کے بعد اب شکاگو میں ان کے ساتھ ملاقات ہو رہی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ ملاقات دونوں کے لیے ٹری مرت کا باعث تھی۔

اسد حسین کے پنجے عمران اور ہارون دونوں اس وقت ساتھ تھے اور چونکہ اسد حسین یونیورسٹی کے کام میں بہت معروف تھے اس لیے عمران نے مجھے یونیورسٹی کا چیئر پریس دکھایا۔ میں اس چھوٹے سے پنجے کی ذہانت اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے واقفیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہاں سے اسد حسین اپنے گھر لائے۔ ہر و فیسر ارڈنگ بھی ہمراہ تھے۔ اسد صاحب کی بیگم احمد نے پُر تکلف چائے پلانی۔ کافی دیر ہم لوگ وہاں بیٹھے۔ رات کو کھانا ڈاکٹر عبدالوحید قری کے ہمارا تھا۔ ان کا مرکان اسد حسین کے مکان سے کوئی انتیس میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن امریکہ میں یہ فاصلہ کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر قری اسٹیٹ یونیورسٹی اف شکاگو میں ایجوکیشن کے پروفیسر ہیں۔ اس بھفل میں اور بھی بہت لوگ شریک تھے۔ سید سلمان ندوی بھی تھے۔ کھانے کے بعد شروع شاعری کا درود چلنا۔ اور جب اسد حسین نے مجھے میرے ہوٹل میں

پہنچایا تو صبح کے ڈبڑھن بچکے تھے۔

(سم)

اے گل بہ تو خُر سندم

رات کو دریز نک جانے کے باعث صحیح آٹھ بجے سے قبل انکھے نکھل سکی۔ اج بارہ بجے تک مجھے ہوٹل سے اٹھ کے ڈاکٹر خورشید ملک کے دہان مستقل ہونا پڑا اس لیے سارے بکھرے ہوئے سامان کو سپیٹا اور اسے سوت کیس میں بند کرنا ضروری تھا۔ اس میں کوئی ایک لکھنٹہ ہرف ہو گیا۔ اس سے فارغ ہو کے عسل کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بی۔ یہ میرے عزیز دوست خلیق قریشی مرحوم کے فرزند افتخار نسیم کا ٹیلی فون تھا۔ افتخار نسیم ہمارے اردو کے جدید شاعر ہیں۔ میں ان کا کلام "اوراق" اور "فنون" میں اکثر دیکھو چکا ہوں۔ ان کا کلام مجھے بہت پسند ہے میکن یہ میں بالکل بھول چکا تھا کہ یہ خلیق قریشی مرحوم کے فرزند ہیں۔ اسی تعلق کی بناء پر میرا ان کا رشتہ دو شاعروں کا رشتہ نہیں ہے، پچھا اور بھتیجے کا رشتہ ہے۔ افتخار سے ملے مجھے ایک مدت ہو گئی تھی۔ تم ۱۹۴۵ء میں خلیق قریشی اللہ کو پیارے ہوئے لاکل پور کا شن ملز کا مشاہدہ اس سے کئی برس قبل بند ہو چکا تھا اس لیے میں شاید لاکل پور ۱۹۴۵ء کے بعد نہیں جا سکا۔ اس وقت افتخار بھی پچھے ہی تھا اور میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی۔ چنانچہ میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ڈاکٹر خورشید ملک سے پلاچھہ لیں۔ میں بخوبی آجداہ گا۔

اس ٹیلی فون کے بعد پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بی۔ یہ افتخار کی بہن نسیم کا ٹیلی فون تھا۔ یہ اپنے گھر سے ٹیلی فون کر رہی تھی۔ ان دونوں چوں کو میرے شکاؤں نے پر جو خوشی ہوئی تھی اس کا اظہار میں شاید بفظوں میں نہ کر سکوں۔ خلیق قریشی کے سال ہا سال ہیلے کے گھر کا نقشہ میری نظریں کے سامنے پھر گیا۔ جب یہ دونوں نئے منے بچے تھے اور میں لاکل پور میں خلیق صاحب کے گھر میں قیام کیا کرتا تھا۔

میں نہادِ ہو کے کپڑے ہی بدل رہا تھا کہ دروازے پر دشک ہوئی اور افتخار اندر آگئے۔ افتخار کو دیکھ کے چاہیس برس پہلے کازماز میری نظر کے سامنے پھر گیا۔ افتخار ڈرے تپاک سے ملے اور با تیس کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں کبھی آبدیدہ ہو گیا۔ یہ دو غیر ملکیوں کی آپس میں ملاقات تھی۔

اگرچہ گیارہ ساری چھ گیارہ کا وقت ہو چکا تھا لیکن میں نے ابھی تک ناشستہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ میں اور افتخار پنج ریٹورنٹ میں گئے۔ ناشستہ کیا۔ اس وقت تک اسد حسین کے بھتیجے انبیاء ز بھی پسخ پکے تھے۔ چونکہ بارہ بجھنے کو تھے۔ اس لیے سامان ہوٹل سے انھا کے افتخار کی گاڑی میں رکھا اور خود ہم لوگ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں جو ملحقة عمارت میں ہے پسخ۔ وہاں پروفیسر ارونگ، ڈاکٹر نجات اللہ، سلمان ندوی، ڈاکٹر حسین اللہ خاں اور ڈاکٹر مسز مدھو جیں سے ملاقات ہوئی۔ یہاں ایک اور صاحب بھی موجود تھے۔ انھوں نے اپنا نام زین العابدین بتایا۔ پہلے تو میں نے نہ پہچانا لیکن جب انھوں نے یہ کہا کہ میری آپ کی ایک مدت تک خط و کتابت رہی ہے تو مجھے سب بیاد آگیا اور یہ بھی کہ انھوں نے پروفیسر حفیظ ملک کی کتاب

Iqbal: Poet Philosopher of Pakistan

مجھے امریکہ سے تحفتاً بھیجی تھی۔ ڈاکٹر زین العابدین ان دونوں کنگ عبد العزیز یونیورسٹی جدہ میں اسلامیات کے استاد ہیں۔ ان کے ساتھ دیر تک باتیں رہیں۔

اب نماز کا وقت ہو رہا تھا اس لیے ڈاکٹر حسین اللہ خاں، ڈاکٹر سلمان ندوی، ڈاکٹر نجات اللہ اور ڈاکٹر زین العابدین نے تو مسجد کا رخ کیا اور افتخار مجھے لے کے لیکن مشیکن کی طرف پہلے۔ لیکن مشیکن کا ساحل صبح کی طرح اس وقت بھی پرستاں بنا ہوا تھا۔

”حلے ہیں شیخ کجھے کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے“
اس ساحل کا منتظر دیکھ کر مجھے چند برس پہلے کایورپ اور برطانیہ کا سفر دوسری بار بیاد آگیا لیکن یہ باتیں ہیں جب کہ آتش جوان تھا، اب تو عرفی کا یہ شعر ہی حسب حال تھا۔
زنقص تنشہ نبی داں بے عقلِ خویش مناز
دست فریب گداز جلوہ سراب نخورد

بہر طور، نظرخوش گز رے — جمیل کے کنارے کنارے کی میل تک پڑھنے کے بعد افتخاریں کے ساتھ میں ان کے مکان پر ہنچا۔ تھوڑی دیر باتیں رہیں اور پھر چہلے سے ٹے شدہ پر دکم کے مطابق افتخار مجھے اسد حسین کے مکان پر ہنچا کر خست ہوئے۔

یہاں پہنچنے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ عزیز نجیسی کے بھائی احمد خاں صاحب کا ٹیکلی فون آیا۔ انہوں نے فیض احمد فیض، قتیل شفافی، زہرہ نگاہ، جمیل الدین عالی، سید ضمیر عجزی، حمایت علی شاعر اور پروین فنا سید کے شکا گو پہنچنے کا مژدہ سنایا۔ یہ حضرات دوچار روز بعد شکا گو پہنچ رہے تھے۔ ۲۹ کے مشاعرے میں شرکت کے لیے۔ اس مشاعرے کا اہتمام پاکستان ادبی فیڈریشن اف کینیڈ انے کیا تھا۔ میں اس میں مدعا نہیں تھا۔ شکا گو میں احمد خاں اس کے منتظم تھے۔ انہوں نے مجھے اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی جو میں نے پر شکر یہ قبول کر لی یہونکہ مجھے ۲۹ تک شکا گو میں رہنا ہی تھا۔

کوئی سات بجے شام کو اسد حسین، سید سلمان ندوی، پروفیسر نجات اللہ صدیقی زین العابدین نماز سے فارغ ہو کے گھر واپس آئے۔ پتا چلا رستے میں کسی دعوت میں گھر گئے تھے۔

رات کا کھانا ڈاکٹر خورشید ملک کے یہاں تھا اور مجھے اب انھی کے یہاں منتقل ہونا تھا۔ چنانچہ میں اپنے ساز و سامان سمیت اسد حسین اور دوسرے دوستوں کے ہمراہ یہاں پہنچا۔ ڈاکٹر خورشید ملک کی پر تخلف دعوت کے بعد ایک مخفی شو منعقد ہوئی جس میں میں نے اپنا کلام سنایا۔ نہ جانے کس سلسلے میں لاہور اور کراچی کے احباب کا ذکر چھڑا گیا۔ اور پھر بات پہنچنی نہیں جوانی تک۔ پطرس بخاری، عبد المجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تترسم، حکیم قیفر محور چشتی، آغا حشر کاشمیری اور علامہ اقبال کی باتیں اور رضاۓ جان مخفی بن گئے اور دیر تک میں اس ماحول میں کم رہا جو مرے لیے دیدہ بھی تھا اور شنیدہ بھی۔

صحیح کے دھائی بجے یہ خوشگوار مخفی انتظام پذیر ہوئی۔ تمام مہمان اپنے اپنے گھروں کو روائے ہوئے اور میں وہیں فروکش ہو گیا۔

(۵)

شکا گاؤں مشاعرہ

رات کو دری سے سونے کے باعث اگلی صبح اور تاخیر سے انکھوں گھلی۔ آج رات کو مشاعرہ تھا۔ کہنے کو تو یہ مشاعرہ شکا گاؤں ہی میں تھا لیکن جہاں میں مقیم تھا دہماں سے مشاعرہ کا ہبہ بنتا ہے میں میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ مقام شکا گاؤں کے مصنافات میں ہے اور اس کا نام ہے مالی دڑ۔ مشاعرہ راما ڈا نام کے ایک ہوٹل میں تھا۔ گوپا اس مشاعرے میں شرکت کے لیے ہم لوگوں نے نوے میل کا سفر کیا۔ شکا گاؤں کے ایک سوا ٹھاں میں مصنافات ہیں اور اسد حسین کے مکان سے خورشید صاحب کے مکان پر جا یہیں یا خورشید صاحب کے مکان سے فرمی صاحب کے مکان پر توانے جانے میں نوے نوے اور سو سو میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ انگ بات ہے کہ برق رفتار موڑوں کی موجودگی میں یہ سفر اتنا طویل معلوم نہیں ہوتا۔ آج اگرچہ سفنتے کا ردز تھا لیکن ڈاکٹر خورشید مدنگ کو اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لیے دو ایک ہسپتاوں میں جانا تھا۔ مجھے بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ تاکہ وہ اپنا کام بھی کر لیں اور میری تھوڑی بہت سیر بھی ہو جائے۔

امریکہ میں اُکے روز اول ہی سے میں ٹیکنا لو جی کے کرشمے دیکھ کے چیراں ہو رہا تھا ڈاکٹر خورشید مدنگ جب مجھے گاڑی میں بٹھا کے باہر جانے لگے تو انہوں نے گاڑی میں رکھے ہوئے ایک ٹین کو دبایا۔ گراج کا دروازہ خود بجود کھل گیا۔ اسی طرح جب ہم ہسپتاوں کے دروازوں پر چہنچتے تھے تو وہ اپنی گاڑی میں رکھے ہوئے کسی ایک ٹین کو دبادیتے تھے۔ ہسپتال کا دروازہ "کھل جاسکم" کی طرح کھل جاتا تھا۔ سہی کیفیت والپسی پر ہوتی۔ ابھی ہم ان کے گھر کی گراج سے دور ہی تھے کہ انہوں نے گاڑی ہی میں ایک ٹین دبایا اور گراج کا دروازہ کھل گیا۔ سہی کرشمہ میں افتخار نہیں کے گھر جاتے ہوئے بھی دیکھ جکا تھا۔

کو لمبیں کے دلیں میں

اب اس طرح "ما فوق الادراک" کر شمتوں سے میرے علم میں تو کیا اضافہ ہوتا تھی تھیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

امریکہ کے ہسپتال دیکھ کے روس کے مختلف شہروں کے ہسپتال یاد آگئے۔ دونوں صفائی اور نفاست میں لا جواب ہیں۔ کیا مجال جو کہیں گرد کا ایک ذرہ بھی نظر آجائے۔ میز، کرسیاں فرش، دیواریں، پینگ ایسے صاف تھے جیسے کسی فاؤ اسٹار ہو۔ میں گھوم رہے ہوں۔ غائبانہ ہسپتالوں میں داخل ہوتے ہی مریضوں کا ادھامِ ضدفع ہو جاتا ہو گا۔ ادھام ہمارے ہندستان کے ہسپتال میں جن میں داخل ہوتے ہی غلط اور عفو نہ سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ اندر بیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں کوئی بیماری ہی نہ چپک جائے۔

اسکی میرے دل ان میں ڈاکٹر خورشید ملک نے اپنے بعض دوستوں سے بھی ملوایا۔ شام کے پانچ ساڑھے پانچ بنجے گھر واپس آئے۔ ارام کیا چاہے پی اور سات بنجے مناڑے میں شرکت کے لیے ہائی و دروانہ ہو گئے۔

یہ مناڑہ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے یوم سالانہ کے سلسلے میں تھا۔ مناڑے سے قبل ایک ڈنر تھا جس کے انتظام میں اسد حسین نے ٹری میٹ صرف کی تھی۔ دو ایک دن بعد میں سامنے امنوں نے کتنے ہی کھانا پکانے والوں کو ٹیکلی فون کر ڈالے تھے۔ ڈنر کے بعد ڈاکٹر اسد حسین نے بعض مہماںوں کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر خورشید ملک نے مناڑے میں شرکت کرنے والوں کو خوش آمدید کہا، ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نے یونیورسٹی کے آئندہ پروگرام کے بارے میں بتایا اور ڈاکٹر محمد وصی اللہ خاں چانسلر یونیورسٹی نے یونیورسٹی کے کام کی رپورٹ پیش کی۔

مناڑے کی صدارت ٹنگ، کراچی کے سابق مدیر سید محمد تقی نے کی اور اس میں راقم الحروف کے علاوہ مندرجہ ذیل شراشیک ہوئے:

افتخار نیسم، خالد انور، سرفراز نیازی، خورشید خضر، سراج الدین صدیقی، سید نقی اختر، عبد الوہید خنزی اور سلمان ندوی۔

سرفراز نیازی علامہ نیازی فتح پوری مرحوم کے فرزند ہیں۔ میں نے انھیں لکھنؤ میں اس وقت دیکھا ہو گا جب یہ پہنچے ہوں گے۔

مناڑے میں اکثر شرا کا کلام پسند کیا۔ افتخار نیسم کی غزل کا یہ مطلع دل میں اُتر گیا۔

آداس بام، گھلادر پکاڑتا ہے مجھے
جلاد بن ہوں مرا گھر پکاڑتا ہے مجھے

مشاعرہ ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔ سامعین کی تعداد بھی خاصی تھی اور وہ ہر اچھے شعر پر بے تحاشا داد دے رہے تھے۔ بالکل ہندستان یا پاکستان کا منظر تھا۔ اور مشاعرے کے دوران میں تو مجھے اس بات کا احساس ہی نہ رہا کہ یہ مشاعرہ امریکہ کے ایک شہر میں ہو رہا ہے۔

یہ مشاعرہ رات کے نوبجے شروع ہوا تھا اور صبح کے ڈیڑھ نوبجے ختم ہوا۔ ہم لوگ پیشتاں میں میں کی منزل ملے کرتے ہوئے کوئی سواد نوبجے کے قریب لگھن پہنچے۔ سوتے سوتے ڈھائی تین نو گئے۔

(۶۱)

اقبال عالمی کا نگریں، لاہور

صحیح کو حسبِ محوال پھر دیر سے جا گا۔ ابھی ما تھے منہ دھور مان تھا کہ ڈاکٹر خورشید نجی
میرے کمرے میں آئے اور فرمایا کہ میز پر ناشستہ لگ گیا ہے۔ میں اوپر ڈاٹنگ ردیم میں
ہے پہنچا۔ ابھی ناشستہ شروع نہیں کیا تھا کہ ٹیلی فون کی ٹھنٹی بھی۔ یہ میرے دوست عزیز قیسی
کے بھائی احمد خاں صاحب کا ٹیلی فون تھا۔ وہ مجھ سے کہ رہے تھے کہ آج شام اگر آپ
فارغ ہوں تو شکا گو ریڈیو کو ایک انٹرو یو دے دیں۔ میں تو فارغ ہی تھا۔ یہاں دعوییں
کھانے کے سوا اور کام ہی کیا تھا۔ آن سے انٹرو یو کا موضوع پوچھا۔ ناشستہ کیا۔ تپچے اپنے
کرے میں آیا اور ڈاکٹر خورشید ملک کی لا بُربری میں سے محمد قطب کی کتاب

ISLAM: The misunderstood Religion

نکال کے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

ڈاکٹر خورشید ملک کی لا بُربری میں اسلامیات پر کتابوں کا ایک بہت عمدہ

ذخیرہ موجود ہے۔ میں نے کہا کہ فلاں فلاں کتاب تلاش بیار کے باوجود مجھے ہندستان میں نہیں مل سکی۔ اب آپ کی لا بئر بری میں یہ کتاب میں دیکھ کے دل پہنچا گیا ہے۔ فرمانے لگے آپ کو جو کتاب درکار ہو آپ لے لیں۔ یہ سب کتابیں یہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ مجھے بآسانی مل جائیں گی۔ مجھے گویا ایک انمول خزانہ ملتا ہاگا۔

ابھی یہ کتاب دیکھ ہی رما تھا کہ پھر سبیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اب کے ایک نسوانی آواز مجھ سے مناطب تھی۔ پہر ڈیو لا اسٹیشن سے میلی فون تھا اور مہر رضوی مجھ سے بات کر رہی تھیں۔ مہر رضوی نے اپنا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ میں حیدر آباد کی رہنے والی ہوں اور پاکستانی ہوں۔ اور پھر خود ہی مزید تعارف کرتے ہوئے ہمیں کہ آپ آخر حسین کو تو جانتے ہوں گے۔ میں نے کہا میرے عزیز دوست ہیں بویں وہ میرے خالو ہیں۔ اب مزید تعارف کی یا اہم ورثت باقی رہ گئی تھی لیکن انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ کیفی اعظمی کی بیکم شوکت میری خالہ ہیں۔ میں نے کہا یہ آپ نہ بتا تیں تو بھی یہ رشتہ ظاہر ہی تھا۔

مہر رضوی نے کہا کہ آج شام کو میں آپ سے WONX ڈیوپر انڈر یو لے رہی ہوں۔ اس سلسلے میں چاہا تھوڑی سی بات آپ سے کروں۔ اسی بات چیت میں ان کے ساتھ انڈر یو کے موضوع کا تعین ہو گیا۔ کہنے لگیں ہم ہندستان اور پاکستان اس وقت امریکہ میں تمدن کے ایک عجیب و غریب پہلو سے دو چار ہیں۔ ہندستانی اور پاکستانی ہمذہ یہوں کا امریکی تہذیب کے ساتھ ربط حبیط جو آج کل کی نسل میں موجود ہے یہ کل کی نسل میں شاید نہ رہ سکے تو اس صورت میں ہندستانی اور پاکستانی اپنے شخص کی بیان کیسے کر سکیں گے۔ میں نے کہا یہ بہت ہی احمد موضوع ہے اور اس پر ڈیو کے انڈر یو میں کھل کر بات ہونا چاہیے۔ شخص کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی تہذیب کی جڑوں کو سلامت رکھنا ضروری ہے۔ ان جڑوں کی ابیاری ضروری ہے ورنہ جڑوں سوکھ جائیں گے اور اس صورت میں پوچھے یا شجر کے شخص یا مشناخت کی بات بے معنی ہو گی۔ اس مختصر سی بات چیت کے بعد انڈر یو کا وقت طے ہو گیا۔ پچھلے بجے شام، اور میں اپنے گرے میں واپس آکے پھر محرقطب کی کتاب دیکھنے لگ گیا۔

جو نکہ ڈیو پر چھٹے بنجے پر دگرام شروع ہوتا تھا اس لیے احمد خاں صاحب

نے کہا تھا کہ وہ پانچ بجے ڈاکٹر خورشید ملک کے مکان پر آگر مجھے راجائیں گے لیکن انھیں اُنے میں دیر ہو گئی اور وہ کوئی سوا پچھے بجے کے قریب چکنے۔ ریڈ یو اسٹیشن غالباً بہت بڑی دور تھا۔ اگرچہ احمد خاں کے پاس ٹرینی گاڑی ہے اور ٹرینی گاڑیاں بہت تیز رفتار ہوتی ہیں لیکن ریڈ یو اسٹیشن پر پہنچنے پہنچنے پونے آٹھ بجے گئے۔ اب پندرہ منٹ میں دیے ہوئے موضوع پر بات چیت تو ممکن نہیں تھی اس لیے مہر رضوی نے اپنے سامعین کے لیے مجھ سے لا ہو را درسیاں کوٹ میں منعقدہ اقبال عالمی گانگریس کے بارے میں پوچھا۔ ہندستان میں اردو کے بارے میں پوچھا اور اس طرح سببندراہ منت ختم ہو گئے۔ اب چونکہ اصل موضوع پر غفتگو نہیں ہوتی تھی اس لیے مہر رضوی نے کہا کہ اگر ممکن ہو تو اس موضوع پر اتوار کو انٹرویو دے دیا جائے۔ اتوار کی شام میرے پاس خالی تھی اس لیے میں نے ہامی بھر لی۔

احمد خاں ریڈ یو اسٹیشن سے مجھے افتخار نیم کے بہار لے آئے۔ وہاں سے ہم سینوں بیسیل بیسر کو نکلنے۔ امریکہ آکے پیسیل چلنے کا اتفاق مجھے آج تک نہیں ہوا تھا اس لیے یہ تجویز میری ہی تھی کہ سوڑ کو چھوڑ کر چہل قدمی کی جائے۔ اتنے میں نو دس بجے گئے۔ احمد خاں اور افتخار نے پاکستانی اور ہندستانی کئی ریسٹورنٹ کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کیے۔ وہ بند ہو چکے تھے۔ میں نے کہا یہ بہت عمدہ بات ہے۔ کسی امریکی ریسٹورنٹ میں جل کے امریکی کھانا کھانا پا جائے۔ انہوں نے کہا پڑا بہار کا بہت عمدہ کھانا ہے۔ پھر یہ وہی لکھاتے ہیں۔ قریب ہی ایک ریسٹورنٹ میں ہو چکے۔ اس کا نام تھا مائی پائی۔ پتا چلا کہ ہانے میں بیف اور پورک ہے۔ میں نے کہا نہ بیف کھافرگا نہ پورک اور کچھ کھلا لیئے۔ سرپینا نامی ویٹریس نے جو ہماری میز کی انچارچی تباہ کر ہم صرف سبزیوں سے بھی پڑا تیار کرتے ہیں اور اس میں ہم بیسر، نماز اور لہسن وغیرہ ڈال لتتے ہیں۔ میں نے کہا یہی تھیک رہے گا۔ چنانچہ پہلے لہسن کا سوپ آیا۔ اس کے بعد سبزیوں سے تیار کیا ہوا پفر۔ دونوں چیزوں بہت لذیز تھیں اور میں بھوک سے زیادہ ہی کھا گیا۔

کھانے کے بعد ہم لوگ افتخار کے مکان پر واپس آئے۔ کچھ دیر گپ شہر رہی اور جب احمد خاں نے مجھے ڈاکٹر خورشید ملک کے مکان پر پہنچا یا تو سارے بارہ بجے چکے تھے۔

(۱۷)

لائل پور کی یادیں

شکاگو میں آئے آج مجھے پانچواں دن تھا لیکن میں ابھی تک اپنی بھتیجی اعجاز نسرین سے نہیں ملا تھا۔ اعجاز نسرین میرے دوست خلیق قریشی مرحوم کی بیٹی ہیں۔ شکاگو میں مقیم ہیں۔ ان کے شوہر نیم سرور بھی میرے دوست رمضان سرور مرحوم کے فرزند ہیں۔ شکاگو آنے کے بعد ان دونوں بچوں سے بیلی فون پر توبات ہوئی تھی لیکن ملاقات ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں پر کیا تھا کہ آج کا دن ان کے ساتھ بسر کیا جائے چنانچہ صحیح کو افتخار آئے اور مجھے نسرین کے گھر لے گئے۔

نسرین کو میں ایک مدت کے بعد دیکھ رہا تھا۔ لائل پور کا آنا جانا جب ختم ہوا تھا تو ہمارا آپس کا ملنا جانا بھی ختم ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں میرے والد مختار کا انتقال ہوا تھا۔ ہندستان اور پاکستان کی جنگ انھی دنوں ختم ہوئی تھی اور دونوں مملکوں میں خط و کتابت بند تھی۔ چنانچہ خلیق قریشی اور نسرین نے مجھے براستہ لندن تعزیت نامے بھیجے تھے۔ ۱۹۴۷ء خلیق قریشی مرحوم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اول تو مجھے ان کے انتقال کی اطلاع بہت دیر میں ملی اور جب میں نے تعزیت کا خط لکھا تو لائل پور تک پہنچا ہی نہیں۔

بہر طور آج ایک مدت کے بعد ان بچوں سے پھر ملاقات ہو رہی تھی۔ افتخار ایک بچے تک ہمارے ساتھ رہے۔ کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا۔ نسرین اب ماں بن چکی ہے۔ اس کا بیٹا ارمغان سرور بہت شرمند ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے میرے ساتھ بات چیت شروع کی اور جب اپنے اور اپنی پڑھائی کے بارے میں مجھے بتانے لگا تو ماں سے کہنے لگا اتنی اب میں بات کر رہا ہوں۔

ابھی ہم لوگ لائل پور کے زمانے کی باتیں کر رہی رہے تھے کہ نسرین کی ایک سہیلی صبا

اور ان کے شوہر افتخار اسد آگئے۔ صبا حیدر آباد کی رہنے والی ہیں۔ بہت عمدہ ادبی ذوق رکھتی ہیں۔ یہاں شکاگو میں زیر تعلیم ہیں۔ ان دونوں ان کے امتحانات ہو رہے ہیں لیکن مجھ سے ملنے کے لیے وقت نکال کے یہاں آہی گئیں اور میرے لیے پار کر کرپیں کا تحفے لے آئیں۔ ایک لکھنے والے کے لیے قلم سے بہتر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔

انہیں میں نسرین کے شوہر نیم سرو دفتر سے آگئے اور محفل کا دائرہ ویسٹ ہو گیا۔ کچھ غریب نظریں ریکارڈ ہوئیں۔ تصویر میں تو بہت ہی کھینچی گئیں جن میں سے بعض مل چکی ہیں اور بعض کا انتظار ہے۔

ہفتے کی رات کو مشاعہ گاہ میں ایم۔ اے فردوسی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے یہاں قیام کرنے کی دعوت دی۔ فردوسی صاحب یہاں الی نائے کے حکمرہ تعلیم میں ایک اعلا اعہدے پر ہیں۔ گوردا سپور کے رہنے والے ہیں۔ لڑکپن میں شحر کہتے تھے۔ علامہ رطیف انور گوردا سپوری کے شاگرد رہے ہیں۔ اب شعر نہیں کہتے لیکن شاعری کا بہت سمجھا ہوا مذاق رکھتے ہیں۔

آج رات کے کھانے کی دعوت ان کی طرف سے تھی۔ انہوں نے ایک نشست کا بھی انتظام کیا تھا۔ ان کا مکان ابی از نسرین کے مکان سے شاید پہا اس میل کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ یہ پہا اس میل سے مجھے یعنی کے لیے نسرین کے مکان پر آئے اور اپنے گھر لے گئے فردوسی صاحب کی بیکم کشور اور نجتوں نزہت، سلمان اور بارون سے مل کے جی خوش ہو گیا۔ سارا گھر مشرقی تہذیب میں رچا ہوا ہے

کھانے پر فردوسی صاحب کے رفیق کارڈ اکٹر حیدر امام اکیم کیم شیخہ حیدر امام ایک اور رفیق کارڈ پروفیسر عبد الباسط ان کی بیکم ناہید اور پروفیسر عبد الوحدہ فخری بھی موجود تھے۔ کشور بیکم نے بہت عمدہ کھانا پکایا۔ نہ جانے اس کے لیے انہوں نے کتنا وقت کچن میں صرف کیا ہو گا۔ اگرچہ فردوسی صاحب نے دو ایک بارہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کھانے کی تیاری میں ان کا بھی مل تھا ہے۔ لیکن ان کی بات کا ہم لوگوں کو یقین نہ آیا کیونکہ وہ تو مجھے یعنی کے لیے تین چار بجے اپنے گھر سے چل چکے ہوں گے۔ وہ خواہ مخواہ اتنے عمدہ کھانے کا کریڈت یعنی کی کوشش کر رہے تھے۔

کھانے کے بعد شروع میں کی محفل جبی۔ بیاض تو میرے پاس تھی نہیں۔ جو کچھ مجھے

زبانی یاد اور ہاتھا میں مُسناہ رہا تھا۔ پر وفیسر عبد الباسط کے لیطفے بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ آخر میں ٹینسہ حیدر امام نے فیض کی غربیں اپنی دلکش آواز میں مُسناہ کر سماں باندھ دیا۔

(۸۱)

میوزیم آف سائنس اینڈ انڈسٹری

اس وقت تک شکاگو میں میرا وقت صرف دعوییں اڑانے اور کلام سنانے میں گزارا تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں دہلی، لکھنؤ، کراچی یا لاہور میں بیٹھا ہوں۔ یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ امریکہ کے شہر شکاگو میں ہوں۔ فردوسی صاحب بات چیت سے یہ بھاپ کئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اور ان کی سلیم صاحبہ نے آج اپنے اپنے دفتر سے نامزد کیا اور میری خاطر شہر کی سیر کا پروگرام بنایا۔ میرا دل اُن کے لیے جذبہ منویت سے ببرہ نہ تھا۔

فردوسی صاحب نے اپنی موڑ کی ڈکی سامان خور دنوں سے بھر لی۔ یہاں گاؤں کی ڈکی کو ڈرنک کہتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور پہنچ کر اور بھی بہت سی چیزوں کھانے پینے کی خرید لیں۔ ساتھ ہی بہت عمدہ سگار خرید کر مجھے عنایت کیے۔ یہاں کے ڈپارٹمنٹل اسٹور دنیا کے ہر بڑے شہر کے ڈپارٹمنٹل اسٹوروں کی طرح عجائب خانے معلوم ہوتے ہیں۔

گاؤں کی ڈپارٹمنٹل اسٹور سے چلی تو خڑائی بھرتی ہوئی شکاگو شہر میں داخل ہوئی۔ شکاگو میں بھی ایک علاقہ ہا میڈ پارک کہلاتا ہے۔ یہ بھیوں کا علاقہ ہے اور سفید فام امریکی اس علاقے سے کم ہی گزرتے ہیں۔ قریب ہی شکاگو یونیورسٹی ہے۔ اس کے پاس سے گزرے تو چودھری نیم یاد آئے جو ان دونوں ہندستان کے ہوئے ہیں۔ میں جب امریکہ آئے ہوئے دو ایک دن کے لیے دہلی میں رُکا تھا تو سر اے عتیق الرحمن قدوالی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ چودھری نیم چند روز کے لیے دہلی آئے

ہوئے ہیں۔

یونیورسٹی سے چند قدم پر میوزیم تھا۔ یہ میوزیم جو ایک قلعہ نما عمارت میں ہے امریکہ کی سائنسی اور صنعتی ترقی کی منہ بولتی تصور ہے۔ سائنسی اور صنعتی دنیا میں آج امریکہ کا مقام بہت اونچا ہے اور یہ عجائب خانہ اس بلند مقام کی ایک علامت ہے۔

یہاں ایک عجیب و غریب کار کامڈل دیکھا۔ اس کا نام ہے

SPIRIT OF AMERICA

اور اس کی رفتار ہے چھٹے سو میل فی گھنٹہ۔ یہ کار شرک شرک پر چھٹے سو انٹھو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل چکی ہے اور اس کو شرک پر اسی رفتار سے چلتا ہوا اوپا کے پیلی دیڑن پر دکھایا جا رہا تھا۔

اسی طرح سے ہوا جہازوں اور سمندری جہازوں کی سال بہ سال ترقی کی تصویر میں اور مادل وہاں موجود تھے۔ ہر شبے میں متعدد پیلی فون رکھتے تھے۔ آپ کسی پیلی فون کو آٹھا کر کان سے لگایں ریکارڈ آپ کو اس شبے سے وابستہ موضوع کے متعلق ترقی کی ساری داستان سنانا شروع کر دے گا۔ حکومت امریکہ کی یہ بات بھی بہت پسند آئی ہے کہ عوام انسان کی جذل ناچ میں اضافہ کرنے کے لیے اس نے کئی سطحوں پر انتظام کر رکھا ہے۔ پیلی فونوں سے ہر کس دن اس نک علم پہنچانے کا طریقہ اسی انتظام ہی کا ایک حصہ ہے۔

اس میوزیم میں ایک اور عجیب و غریب چیز دیکھی اور یہ اپا لوہ کا دہ کیسی سوں تھا جو چاند سے ہو کے زمین پر داپس آیا تھا۔ یہ تاریخی واقعہ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء سے ۲ دسمبر ۱۹۶۵ء تک کی مدت میں روپناہ ہوا تھا جب نیل آرم اسٹرانگ اور اس کے ساتھی چاند پر پہنچ کر وہاں سے علوکا خزانہ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ چاند پر اترنے والی بھی کا دہ اصل منونہ بھی دیکھا جس میں نیل آرم اسٹرانگ اور اس کے ساتھیوں نے چاند پر اترنے کی تربیت حاصل کی تھی اور وہ اپس سوٹ بھی دیکھے جو پہن کر یہ لوگ چاند پر کئے تھے۔

اس میوزیم کو ایک مرسری نظر دیکھنے میں کئی گھنٹے صرف ہو گئے اور ہم لوگ جب باہر نکلے تو میری زبان پر اقبال کا یہ مصروع تھا سے

طلوعِ فرد اکا منتظر رہ کہ دوش دامر وزہ ہے فنا نہ

میوزیم سے باہر آئے تو دیکھا کہ اچھی خاصی بارش ہو رہی ہے اس لیے جبیل کے کنارے پک نک کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا اور یہ طے ہوا کہ کھانا اب گھر چل کے کھایا جائے لیکن

ابھی ہم لوگ گھر سے کچھ فاصلہ پر تھے کہ بارش تھم گئی۔ ملکی ملکی دھوپ نکل آئی۔ موسم بہت خوشگوار ہو گیا اور ہمیں پک نیک کے لیے ایک مناسب جگہ بھی نظر آگئی چنانچہ دہیں ہم نے گاڑی روک لی اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ اس طرح سے کچھے میدان میں تدلت کے بعد کھانا کھانے کا موقع ملا تھا چنانچہ اس میں اور زیادہ لطف آیا۔

گھر پہنچنے تو شام ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر ہجتوں کے ساتھ بیٹھ کے ٹیلی و بیڑن دیکھا۔ رات ہوئی، کھانا کھایا اور پروفیسر عبد الوہید فخری کی معیت میں ڈاکٹر خورشید ملک کے دولت کدے پر واپس پہنچا۔ اگرچہ خاصی دیر ہو گئی تھی سیکن ڈاکٹر صاحب ابھی جاگ رہے تھے۔ شاید ابھی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے پہنچتے ہی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اتنے میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر وصی اللہ خاں صاحب دہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر خورشید ملک کے ساتھ کچھ دیر ان کی یونیورسٹی کے انتظامیہ امور کے متعلق باتیں ہوئیں۔ کسی کمیٹی کے متعلق کچھ فیصلہ ہونے اور جب چانسلر صاحب اور فخری صاحب رُخضت ہوئے تو کوئی بارہ نکل چکے تھے۔

(۹)

کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

آج کادن ارام کے لیے جان بوجھ کے خالی رکھا تھا۔ لندن، جموں، سری نگر اور دو ایک اور جگہوں پر خطوط بھی لکھنا تھے۔ زیر تحریر سفرنامے کو بھی مکمل کرنا تھا اس لیے گھر ہی پر قیام ضروری تھا۔

یہ سفرنامہ لکھنے ہی رہا تھا کہ احمد خاں صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے یاد دلایا کہ محل پھر ہیڈ یو پرانٹر یو یو SBC ریڈیو پر تھا اور ساتھ ہی یہ بھی مُژدہ سنایا کہ وہ دن میں بارہ بجے تشریف لائیں گے اور مجھے پہنے ساتھ لے جائیں گے۔ سارا دن

سیر و تفریح میں گزرے گا۔ شکا کو بونی و رستی کی لا بہر بری بھی دیکھیں گے۔ بہائی مندر بھی۔ سیز رہا ور بھی اور اس کے علاوہ اور بعض جگہیں بھی جن میں پرانا شہر خاص طور سے شامل ہے۔ مجھے یہ پروگرام سن کر مسترت ہوئی۔ خاص کر اس بات سے کہ آج دن بھر آدم کریٹنے کے بعد کل لمحو منے پھرنے کے لیے تازہ دم ہو چکا ہوں گا۔

(۱۰)

شکا کو کی ایک جھلک (۱)

آج احمد خاں حسب وعدہ بارہ بجے تشریف لے آئے اور مجھے اپنے ساتھ گھمانے پھرانے لے چلے۔ ان کے پروگرام میں سب سے پہلے شکا کو کے پرانے شہر (OLD CHICAGO) کا ماذل تھا۔ ہم دونوں دہائیں پہنچنے تو پتا چلا کہ بند ہے۔ یہ ماذل ایک قلعہ نما عمارت کے اندر رہے۔ قلعہ نما عمارت کو باہر ہماسے ایک نظر دیکھا۔ بہت بڑی عمارت تھی لیکن اس کے اندر کیا ہے یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اب یہ شاعری تو تھی نہیں کہ میں زبرد دن در گز کشم ز درون خان لگفتہ

کہتا ہو اگزر جاتا۔ بہر طور اب دہائی سے دوسرے پڑا کاڑھ کیا۔ یہ بہائی ٹمپل تھا لیکن ابھی ہم چند میل ہی گئے ہوں گے کہ موڑ کا پڑوں ختم ہو گیا۔ گاڑی احمد صاحب نے سڑک کے ایک کنارے لگاڑی۔ میں نے سوچا ریزو میں کچھ ہو گا تو پتا چلا کہ اس وقت تک وہ گاڑی ریزو ہی پر چلا رہے تھے۔ اب کیا کیا جائے؟

امد صاحب نے کہا کہ کسی گاڑی کو روکے یہتے ہیں۔ اس میں بیٹھ کے پڑوں پہیں لے آؤں گا لیکن غائب اور کسی گاڑی کو روک نہ سکے۔ ہوا سے باتیں کرتی گاڑیاں کب کسی کے اشارے کو دیکھتی ہیں؟ چنانچہ انھوں نے پڑوں اسٹیشن نک پیدل جانے کا ارادہ کیا۔ مجھ سے کہنے لگے آپ کو پڑھنے کے لیے کوئی کتاب دے جاؤں؟ مر تائیا نہ کرتا

میں نے کہا ہو تو دے جائے۔ انہوں نے "تخمیقی ادب" کی پہلی جلد گاڑی میں سے نکالی۔ یہ کتاب جو مجھے کچھ مدت قبل مشق خواجہ نے عنایت کی تھی میں اول سے آخر تک پڑھ چکا تھا۔ بہر طور اس کی ورق گردانی شروع کی سیکن پڑھے ہوئے مفہایں نظم و نثر کہاں تک پڑھتا۔ انتہائی بے دلی کے عالم میں سکار سلگایا سیکن مزہ نہ آیا۔

گاڑی حبھل بیابان میں سڑک کے ایک طرف کھڑی تھی اور میں اس میں

بے دلی ہائے تماثا کہ ن عبرت ہے ن ذوق

کی تصویر بنایا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اج سردی بھی تھی اور میں اج ہی کوت میں اکار بش شرٹ پہن کر گھر سے نکلا تھا۔ ایک عجیب وحشت سی ہونے لگی۔ ایک نچکا تھا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میری جبیں کچھ رقم تو تھی سیکن بہاں آبادی کہاں تھی۔ یوں تو اس پاس نین چار سڑکیں ادھر سے ادھر چارہ ہی تھیں۔ دو ایک ہماری سڑک کو کاشتی ہوئی بھی گزر رہی تھیں اور اسی اپنی سڑک پر بھی ایک منت میں کم از کم پچاس سانچھے موڑ میں سڑک گزر رہے ہوں گے۔ ہوانی جہازوں کا سورج بھی ایک ایک دیڑھ دیڑھ منت بعد سنا لی دیتا تھا۔ شاید کوئی اپر پورٹ قریب ہی ہو گا سیکن آبادی کا دور دوڑنک کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ اور میں اُتر کے جاتا بھی کس طرف کو۔ سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں سڑکوں اور لاریوں کو دیکھتا رہا۔

اس سڑک پر کوئی چھوٹی گاڑی چلتی نظر نہ آئی۔ سب بڑی گاڑیاں تھیں اور برق رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔ میں جب سے امریکہ میں آیا ہوں چھوٹی گاڑیاں شاذ و نادور رہی دیکھنے میں آئی ہیں۔ ان نو دنوں میں موڑ سائل صرف دوہی دیکھے ہیں اور اسکو نہ صرف ایک۔ ہاں ڈر کوں کا کوئی شمار نہیں اور ڈرک بہاں ہمارے ملک کے نر کوں سے کم از کم تین چار گناہ زیادہ طویل اور دو تین گناہ زیادہ اوپنے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جسے کوئی بہاڑ کا پہاڑ پاس سے سر پٹ دوڑا جا رہا ہو۔ بلا مہال خوب جب بھی کوئی ڈرک میری ساکن گاڑی کے پاس سے گزرتا تھا گاڑی طوفانی کشتی کی طرح جھول جاتی تھی۔ پہلے تو مجھے اس بات سے ذرا سی گھرا ہٹ ہوئی مگر جب دوچار منت کے اندر اندر یہ بات دوچار بار رو نما ہوئی تو میدے فکر ہو کے بیٹھ گیا سیکن نظر دور سامنے پہل پر جمی رہی کر دیکھیں احمد خاں کب واپس آتے ہیں۔ احمد خاں بہت عمدہ ادمی ہیں۔ اردو سوسائٹی آف امریکہ اینڈ کیشیڈ نام کی ایک جماعت

انہوں نے قائم کر رکھی ہے۔ امریکہ اور یونیورسٹیا کے طول و عرض میں مشاعرے اور حلے سے منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اردو کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام بھی ان کے پیش نظر ہے۔ اس وقت اپنے بھائی عزیز قیسی کا مجموعہ کلام اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع کر رہے ہیں۔ لگذشتہ برس اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام انہوں نے سردار جعفری، یقینی اعظمی جسن کمال، عزیز قیسی بیکل اتساہی اور بعض اور شعراء کو پہلے مذاکروں میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

میری آنسیں اس وقت قل هو اللہ پڑھو رہی تھیں۔ نگاہیں سامنے بل پر تھیں کہ احمد خاں خالی ہاتھ و اپس آتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھ میں پڑوں کا کوئی ٹین وغیرہ نہیں تھا۔ پچارے ہاتھ سے ہوئے اُرہے تھے۔ کہنے لگے پڑوں پر تو خدا جانے کتنی دور ہے۔ مجھے قریباً ہی ایک جگہ ٹیکی فون مل گیا۔ میں نے ایک ارگناائزیشن کو جس کا ممبر ہوں ٹیکی فون کیا ہے۔ وہ لوگ پڑوں پر پہنچنے والے فون کریں گے وہاں سے ایک گاڑی آئے گی جو ہماری گاڑی کو کھینچ کر پڑوں پر تک رے جائے گی۔

یہاں کی شہری زندگی کا کمال یہ ہے کہ کوئی آدھ لگھنے میں پڑوں پر پہنچنے سے گاڑی اگکی۔ ڈرائور نے اسیں سے اُتر کے دوز خیر میں ہماری گاڑی میں ڈالیں، ہمیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور آنا گافانا پڑوں پر پہنچنے لے آیا۔ یہاں احمد خاں نے گاڑی کی ڈنکی پڑوں سے بھری اور ہم پھر سفر پر نکلے۔

سب سے پہلے ایک ریسٹورانٹ میں پہنچنے۔ وہاں کھانا کھایا۔ وہاں سے نکلنے تو ای نائل یونیورسٹی سامنے نہیں۔ اس یونیورسٹی میں چونکہ چند روز بعد جانے کا پروگرام تھا اس یہے اس وقت ہم اس متریل سے گزرے ہی چلے گئے۔ وہاں سے اُنکے ہمراہ تو ایک بازار میں داخل ہوئے جہاں بازار کے وسط میں عین ہمارے اوپر ریل کی پٹریاں تھیں۔ ہم ان پڑوں کے پیچے کی میل تک پہنچنے لگئے۔ اوپر گھٹا گھٹ کرتی ہوئی ریل گاڑیاں آجاتی ہی تھیں۔ پیچے موڑ رہی تھیں۔

اس بازار سے نکلنے تو نار تھوڑیست یونیورسٹی سامنے تھی۔ عبداللہ غازی ان دنوں اسی یونیورسٹی میں ذرمنگ پروفیسر ہیں۔ ان کی اپنی یونیورسٹی کنگ عبد العزیز یونیورسٹی جدید ہے۔ ان دنوں اس یونیورسٹی میں پڑھاتے تھی ہیں اور ساتھو رہی امریکہ میں مقیم مسلمان طلبہ کے بیان انگریزی میں سیرۃ النبی ﷺ پر مبنی ریڈر میں بھی تیار کر رہے ہیں۔ غالباً ان ریڈر وہ

کی تعداد بیس تک پہنچے گی۔

اس یونیورسٹی سے قریب ہی ایک بہت عالی شان شاپنگ سنٹر ہے، اور ڈراما ور پلیس شاپنگ سنٹر، جس میں کمی مزدیس ہیں اور ہر منزل تک جانے کے لیے بفت اور ایکٹیسو موجود ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے شاپنگ سنٹر تو عجائب خانے ہیں اور میں نے بھی اسے عجائب خانہ سمجھو کے اس کی سیر کی۔ شاپنگ سنٹر سمجھو کے جاتا تو اس ہونا پڑتا۔ کل افتخار نیم نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ وہ چار بجے اپنے گھر پر میرا انتظار کریں گے سو چاہاں کے دہائیں چنانچہ ایک پڑول پمپ پر گاڑی روک کے احمد خاں نے انھیں ٹیلی فون کیا۔ میں ایک کوکا کولا اور مٹھائی کی مشین کو دیکھنے لگا جس میں سکے ڈال کے چیزوں حاصل کی جاتی ہیں۔ مشین میں تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس طرح کی مشینیں اس سے قبل یورپ اور انگلستان میں بھی دیکھ چکا تھا اور اب یہاں بھی دیکھ رہا تھا اسکیں خاص بات اس عمارت میں تھی جو اس مشین پر لکھی تھی اور وہ یہ تھی

THE MONEY
IS REMOVED FROM THIS MACHINE
EACH NIGHT DONT RISK ARREST

انتہیں احمد خاں نے اگر بتایا کہ افتخار نیم گھر پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں دہائی پہنچے، چاہے پل اور تادہ دم ہو کر پھر سیر کو نکلے۔ اتفاقی رائے سے طے یہ ہوا کہ بہائی نپبل کارخ کیا جائے۔

گھر سے چلے تو پھر نار تھوڑی یونیورسٹی سامنے تھی۔ اس کے بعد ہودیوں کی ایک بہت بڑی کالونی سے گزرے۔ پانچ سات میل اور گئے ہوں گے کہ بہائی نپبل کی عمارت آسمان سے باشیں کرتی نظر آئی۔

یہ نپبل ۱۹۵۳ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس وقت دنیا کے مختلف حصوں سے لاکھوں سیاح اسے دیکھ چکے ہیں۔ اس نپبل کے باغات اور اس کی صاف سطھی محظوظ فضایاں پہنچ کر ہماری دن بھر کی تھیں رور ہو گئی۔ یہاں پہنچتے ہی افتخار نے قرۃ العین ظاہر ہلاذ کر کیا اور میرا احساس ان اشعار کی نغمگیری میں کھو گیا جو قرۃ العین ظاہرہ کے بہائی ذہب کے ہاند کے ساتھ عشقی روحانی سے لمبریز ہیں۔

گر پر تو افتاد نظر چہرہ بہ چہرہ رو برد
 شرح دہم غم فراق نکتہ ہے نکتہ مو بہ مو
 از پے دیدن رفت ہم چو مبافتادہ ام
 شہر بہ شہر در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو
 می رو د از فراق تو خونِ دل از رو دیدا م
 د جبلہ بہ د جبلہ یم بہ یم قطرہ بہ قطرہ جو بہ جو
 در دل خویش طاہرہ لکشت وندید ہجز ترا
 صفو پ صفحہ لایا لایا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

اس نمپل کے اندر اور باہر دو ایک گھنٹے تک سیر کر کے ہم واپس آئے۔ افتخار ایسٹر و نامی ایک ریشورنٹ میں لے گئے جہاں اب کے ہم نے یونانی کھانا کھایا۔ بہت لذید تھا۔ امریکی کھانے کی طرح۔ بیف اور پورک دنلوں سے مفرزا۔

ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ دیر بھی بہت ہو گئی تھی اور ڈاکٹر خورشید ملک کا مکان بھی بہت دور تھا۔ افتخار کا مکان بہت قریب تھا۔ اس لیے افتخار کے مشورے پر میں اُس رات اُنھی کے یہاں ٹھہر گیا۔ ٹیلی فون پر ڈاکٹر خورشید ملک کو اطلاع دے دی۔

(11)

شکا گوک ایک جھلک (۲)

افتخار کے ساتھ رات کو دیر تک باتیں ہوتی رہی تھیں اس لیے صبح دیر میں اُنکو کھلی۔ تیار ہونے ہوتے دس نجھ گئے۔ روانہ ہونے لگے تو افتخار نے تھائی سے لاد دیا۔ میں اس پنجھے کی یہ محنت اور خلوص دیکھو کر بہت مناثر ہوا۔ میری انکھوں میں انسو آگئے۔ میں

نے کہا میں یہ سب تھائے اٹھاؤں گا کیسے۔ کہنے لگے میں یہ سب سوچ کیس میں بند کر کے آپ کو پہنچا دوں گا۔

شاید گز شستہ میں کی بات ہے میں پاکستانی احباب کے تھائے سے لدا بھندا کراچی سے گھر پہنچا تھا۔ چند روز بعد میری بیوی اپنی بیٹی سے کہ رہی تھیں کہ تمھاری شادی کے تھائے میں اگرچہ دنیا بھر کے ملکوں سے ائے ہوئے تھائے شامل ہوں گے لیکن مجموعی طور پر صرف پاکستان کے تھائے دنیا کے تمام ملکوں کے تھائے سے زیادہ ہوں گے وہ اسے بڑے فخر سے بتا رہی تھیں کہ تمھاری شادی کے وقت میں تھیں وہ گولڈ میڈل بھی دوں گی جو اقبال عالمی کانگریس لا ہونے تھا رے والد کو دیا تھا لیکن ساتھ ہی وہ تحفہ بھی ہو گا جو پاکستان کے صدر محترم نے انھیں دیا تھا۔

اور آج جب افتخار نے مجھے تھائے سے لاد دیا تھا تو مجھے اپنی بیوی کی یہ بات جو وہ پو نم سے کہ رہی تھیں یاد آگئی اور میں ایک عجیب نشے کی کیفیت میں ڈوب گیا۔ لیکن افتخار کے ساتھ میرا رشتہ صرف پاکستان، ہی کے تعلق سے نہیں ہے بلکہ یہ پچھا بھیتھیج کا رشتہ ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا افتخار کو ترقی درجات عطا کرے اور اسے علم، صحت اور خوشی ای سے نوازے! ہم دونوں گھر سے نکلے تو افتخار نے ظفر اقبال کے اشعار سنائے۔

بس ایک بار کسی نے گلے لگایا تھا پھر اس کے بعد نہ میں تھا ان میرا سایا تھا گلی میں لوگ بھی تھے میرے اس کے دہن لوگ وہ سب پہنچتا ہوا میرے دل میں آیا تھا اتنے میں لا ہیوا بیوی ورثی تک پہنچ گئے۔ لیکن آج اس بیوی ورثی میں جانے کا پروگرام نہیں تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ بیٹی نسرین کو ساتھ لے کر میر کو چلیں گے۔ چنانچہ نسرین کے دہانی پہنچے۔ دہان کھانا کھایا اور جھیل کی سیر کو نکلے۔ لیکن مشیگن کی فضنا روچ میں نازگی اور بالیگی پیدا کر دیتی ہے۔ بہت دبر اس کے کناروں کی سیر کرتے رہے۔ کوئی تین بجے افتخار کے گھر واپس آئے کہ احمد خاں کو دہان آکے مجھے دو اور ریڈ یو اسٹیشنوں پر لے جانا تھا۔

ان دونوں ریڈ یو اسٹیشنوں پر میرا انٹر ویو تھا۔ ان کے نام تھے WTAQ اور WEEF ریڈ یو۔ پہلا انٹر ویو امریکہ کے بارے میں میرے تاثرات سے متعلق تھا اور دوسرا اردو مشاعروں کے آغاز اور انتفاق کے بارے میں۔ یہ دوسرا انٹر ویو ریڈ یو کی جانب سے افتخار نیم نے لیا۔ ان کے سوالات بہت دلچسپ اور اہم تھے۔ انٹر ویو ختم ہوا تو نون

چکے تھے۔ وہاں سے ڈاکٹر خورشید ملک کے دولت کدرے کا رخ کیا۔ پہنچتے پہنچتے دس بج گئے۔

(۱۲۱)

آئے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

اُج ڈیڑاٹ سے پاکستان شرائی پاکستان لٹریری فیڈریشن اف کینیڈا کی دعوت پیر امریکہ اور کینیڈا کے مشاعروں میں شرکت کے لیے اُئے تھے شکا گو پہنچ رہے تھے۔ وہ لوگ شام کو پاپنچ بجے کے قرب ہمہاں پہنچے۔ ۸ بجے مشاعرے کا وقت تھا۔ میں ڈاکٹر خورشید ملک اور ان کے بھائی سلطان ملک کے سہراہ عین وقت پر مشاعرہ گاہ میں پہنچ گیا لیکن مشاعرہ کچھ تاخیر سے شروع ہوا۔ مشاعرہ آخر مشاعرہ ہے۔ ہندستان میں ہو پاکستان میں ہو یا امریکہ میں۔ پابندی وقت سے اس کا کیا تعلق؟

مشاعرہ یعنی ایک ہائی اسکول (شکا گو) کے اڈیوریم میں منعقد ہوا۔ پاکستان سے اس میں شرکت کے لیے قتیل شفائی، جمیل الدین عالی، حسین عجفری، حمایت علی شاعر، پروردین فنا سید اور صہبیا اختر تشریف لائے تھے۔ اس مشاعرے کا شکا گو میں انتظام پاکستان فیڈریشن اف کینیڈا کی جانب سے احمد خاں صاحب ہی نے کیا تھا۔

تحویری دیر میں پاکستانی شرائی مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے۔ میں تو ان کے لیے سراپا انتظار تھا۔ ان سے ملتے ہی کسی اور ہی عالم شوق میں پہنچ گیا۔ قتیل سے ابھی دو ماہ قبل مخدہ عرب امارات (ابوظہبی، دوبی اور شارجه) کے مشاعروں میں ملاقات ہوئی تھی۔ بلکہ کوئی ایک سختے تک ہم ایک ہی ہوٹل میں ایک ساتھ مقیم رہے۔ حسین عجفری اور حمایت علی شاعر کے ساتھ تین ماہ قبل کراچی کے مشاعروں میں ملاقات ہوئی تھی۔ حسین عجفری اور میں تو کراچی میں ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے۔ پروردین فنا کے ساتھ ملاقات ایک زمانے

کے بعد ہور ہی تھی اور صہبا اختر کے ساتھ غاباً پہلی ملاقات تھی۔

لیکن عجیب ہات یہ تھی کہ یہ ملاقات امریکہ میں ہو رہی تھی اور ملاقات کا سبب اردو زبان اور اردو شاعری تھی۔ دنیا کی تیسری بڑی زبان کو اتنا کرنٹھمہ تو کم از کم دکھانا ہی چاہے۔

قتیل سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے مجھے اپنے لڑکپن کالا ہو ریا دا جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے مناظر نظر کے سامنے آنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ زمانہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے جب ہم دونوں میکل اور روڈ اور نسبت روڈ کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ قاسمی صاحب بھی اُس زمانے میں میکل اور روڈ یا نسبت روڈ کے قریب ہی کہیں رہتے تھے۔ ہم دونوں اکثر ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔

قتیل کے تعلق سے لاہور، راولپنڈی اور ملتان کی نہ جانے کتنی یادیں وابستہ ہیں۔ قتیل کے ساتھ لاہور کراچی یاد ہلی میں ملاقات ہو تو بھی میری مستر کاٹھکانا نہیں رہتا اور رہباں امریکہ میں جب ملاقات ہوئی اور وہ بھی خلافِ توقع تو یہ بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنی خوشی ہوگی۔

آج کا دن یوں بھی بڑی مستر کا دن تھا کہ لندن سے بیٹی (پر ملا) کائیلی فون ملنے کا سامنے پھر گئے۔ پر ملا لندن میں میری آمد کے انتظار میں تھی۔

ہاں تو یہ مشاعرے کا ذکر کر رہا تھا۔ مشاعرے کے آغاز کا اعلان پر فیسر عابد اللہ غازی (کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ) نے کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے رقم الموقوف کی صدارت کا اعلان بھی کیا اور میری معمولی ادبی اور علمی خدمات کا ذکر ایسے توصیفی انداز میں کیا کہ میں اپنی بے علمی کی بنابری سرم میں پانی پانی ہو گیا۔

مشاعرہ کوئی نوبخ شروع ہوا اور روڈیڑھ بجے تک جاری رہا۔ تمام شعر اکا کلام سامعین نے بڑے ذوق و شوق سے سننا اور ایک ایک مشاعرے متعدد غزیں اور نظمیں سنائیں۔ جمیل الدین عالی کی نظم "جیوے جیوے پاکستان" تمام سامعین نے پسند

کی جن میں پاکستانی بھی تھے اور ہندستانی بھی۔ امریکہ میں مقیم ہندستانیوں اور پاکستانیوں کے اس باہمی جذبہ محبت سے میں بہت متاثر ہوا۔ کاشش یہ جذبہ محبت ہندستان اور پاکستان میں اس حد تک پڑھ جائے کہ دونوں ملکوں میں کبھی کوئی جنگ نہ ہونے پائے اور دونوں اپنے اپنے فوجی بیکٹ کا بیشتر حصہ اپنے اپنے عوام کی تعلیم اور صحت کی بہتری پر خرچ کریں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروع پر خرچ کریں۔

اس مشاعرے میں پاکستان سے آئے ہوئے شوا اور اس خاکسار کے علاوہ مقامی شوانے بھی اپنا کلام پڑھا۔ مقامی سے میری مراد ہے وہ شرعاً جو امریکہ میں مقیم ہیں اور جن کا ذکر ہے آپ کا ہے مثلاً پروفسر بدرا اللہ غازی، افتخار نیم، خالد خواجہ، خالد انور، عترت حسین، نصیرہ ملک، سرفراز نیازی اور سمر فتح پوری۔

اگرچہ مشاعرے کے دوران میں بھی آٹو گراف اور تصویروں کا سلسلہ جاری رہا لیکن ڈیڑھ دو بنجے کے قریب جب مشاعرہ ختم ہوا تو آٹو گراف بکس اور کیروں کا سیلا ب آگیا۔

پاکستان کے شوار دوسرے دن ہی شکاگو سے روانہ ہو رہے تھے اور ان دوستوں سے گلے ملتے ہوئے سعدی رحمانی کا یہ شعر مجھے بار بار پادا رہا تھا۔

می روی د گری یہ می آید مرا
یک دمی بُشیں کہ باراں بگز رد

اُس رات شکاگو میں مقیم رکتے ہی ہندستانیوں اور پاکستانیوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ دوسرے دن تمام ہمہ ان شوا کو اپنے اپنے یہاں مدعو کریں لیکن قتیل شفافی نے کہا کہ دعوتوں میں گھر جانے سے ہماری شکاگو کی بیبر خراب ہو جائے گی۔ ہم کل کاسارا دن سیر میں صرف کرنا چاہتے ہیں۔ فدو کی صاحب اور افتخار نیم نے اس تجویز کی تائید کی اور یہ طے ہوا کہ کل جمع تمام احباب راماڑا ان ڈاؤن ٹاؤن سے جہاں پاکستان کے شرعاً مقیم تھے شکاگو کی سیر کو نکلیں گے۔

اب اس زمرے میں میں تھا جو ڈاؤن ٹاؤن سے دور ڈاکٹر خورشید ملک کے یہاں تھہرا ہوا تھا۔ چنانچہ مجھے ڈاؤن زگرود سے راماڑا ان ٹاک لے چلنے کی ذمہ داری فدو کی صاحب نے لی اور ہم ایک دوسرے کو شب بخیر کہ کے اپنی اپنی قیام گا ہوں پر واپس آئے۔

(۱۳)

شکاگو کی ایک جھلک (۳)

آج صحیح فردوسی صاحب حسب وعدہ تشریف لائے اور ہم دونوں راماڑا ان ڈاؤن ٹاؤن پہنچے۔ وہاں قتیل، ضمیر جعفری، حمایت علی شاعر اور افتخار نیم بمارے منتظر تھے۔ جمیل الدین عالی وہاں نہیں تھے۔ مجھے رات کو قتیل نے یہ بتایا تھا کہ وہ بھی صحیح ہو ٹیل میں موجود ہوں گے لیکن وہ نیشنل بنک آف پاکستان کے منیجر عباسی صاحب کے وہاں مقیم ہوئے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ عباسی صاحب کا مکان ڈاکٹر خورشید ملک کے مکان سے بہت قریب ہے درجہ جمیل الدین عالی سے ان کے گھر پر جا کے مل بینا دشوار نہیں تھا۔ بہر طور عالی سے اس وقت نہ ملنے کا اور شکاگو کی سیر میں ان کے شریک نہ ہونے کا افسوس ہوا۔ حمایت علی شاعر سارے ڈیلیکیشن کے پروگرام کے متعلق نیو یارک اور نیوجرسی ٹیلی فون کر چکے تھے اور اب نیو یارک سے ٹیلی فون کے انتظار میں تھے۔ میں نے کہا یا تم نے اپھی بیڈری سہیڑی ہے کہ ایک ٹیلی فون کے لیے ہمیں اپنی رفاقت سے محروم کر رہے ہو لیکن غالباً وہ ٹیلی فون ضروری تھا کیونکہ اس ڈیلیکیشن کے نیو یارک سے پیرس، پیرس سے لندن اور لندن سے کراچی تک کا سفر اسی ٹیلی فون سے وابستہ تھا۔ چنانچہ فردوسی صاحب اور افتخار نیم کی قیادت میں جعفری، قتیل اور برائیم التحریر سپر کو نکلے۔ پہلا پڑا سیزر ٹاؤن SEARS TOWER تھا۔ دنیا کی سب سے اوپری عمارت جس میں ایک سو دس منزلے ہیں۔ اس کی پہلی منزل ایک فلانگ لمبی اور ایک فرانگ چوڑی ہے۔ جوں جوں اوپر جاتے ہیں اس منزل کا رقمہ کچھ کم ہو جاتا ہے۔ لفت ہمیں ایک منٹ سے کم و قبے میں ایک سو تیسرا منزل پر لے گئی جوز میں سے ۲۵۳ فٹ کی بلندی پر ہے۔ وہاں میلے لگا تھا۔ اس کے باوجود اتنی جگہ تھی کہ ہم آسانی سے گھوم پھر سکتے

تھے۔ اس منزل سے سارا شکاگو ناظر آ رہا تھا۔ دھوپ نخلی ہوئی تھی اور اس دھوپ میں شکاگو ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔

اس بلندی سے جس پر ہم لوگ تھے فلک بوس عمارتیں خاصی پست قد نظر آ رہی تھیں مشیگن جھیل جو قریب سے سمندر نظر آتی ہے اس وقت ایک چھوٹی سی جھیل کے ماذل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ دریاے شکاگو ایک پتلے سے سانپ کی طرح لہراتا ہوا جا رہا تھا اور پڑوں پر ریل گاڑیاں یوں دوڑ رہی تھیں جیسے پتوں کی کھلونا ریل گاڑیاں نہیں منی پڑیں پر دوڑتی ہیں۔

سینز رہا درکاڈ زائن پاکستان کے ایک آرکٹیک فضل الرحمن نے بنایا تھا۔ تین سال میں یہ عمارت مکمل ہوئی اور وہ بھی اس صورت میں کہ بعض اوقات اس پر پہیک وقت سور سومستری اور کارگر کام کرتے رہے۔ اس عجیب و غریب عمارت کی تعمیر میں جس کی پوری اونچائی ایک ہزار چار سو چوٹن فٹ ہے اور جس نے فضنا میں سارے چالیس لاکھ گراس مرنج فٹ رقبے کو گھیر رکھا ہے۔ پہنچتہ ہزار ٹن فولاد حرف ہوا ہے۔ پوری عمارت کا وزن دو لاکھ بائیس ہزار پانصوتن ہے۔ اس میں سولہ ہزار سے زیادہ کھڑکیاں ہیں اور انھا میں ایک سیاہ رنگ کے ایلو مینیم کی پعادر چڑھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تیسرا بلند ترین عمارت بھی شکاگو میں ہے اور اس کا خاکہ بھی فضل الرحمن ہی نے تیار کیا تھا۔ دوسری بلند ترین عمارت نیو پارک میں ہے۔

سینز رہا در کے بعد ہمارا پروگرام شکاگاں کے فن کو ایک نظر دیکھنا تھا۔ شکاگاں فرانس کا ایک جدید مھوار ہے اور اس نے شکاگو میں آ کے murals بنائے تھے۔ یہ میدرال آج شکاگو میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور دور دور سے سیاح انھیں دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

یہاں سے فردوسی صاحب اور افغانیارہمیں جان میر و John Muro کے مجسمے دکھانے کے لیے لے گئے۔ جان میر و ایک ہسپانوی فن کار ہے۔ اس کا بنایا ہوا ایک مجسمہ دیکھا تو قتیل نے سید محمد عجفری مرحوم کا مصروع پڑھا جس کو مجھا تھا اننا س وہ عورت نخلی اس کے قریب ہی پکا سوکا بنایا ہوا پیش کیا اور تابنے کا ایک اور مجسمہ نصب تھا۔ افغانیارہ

نے جوار دو کے علاوہ انگریزی میں بھی داد سخن دیتا ہے اور قدیم اور جدید فن پر جس کی گہری نظر ہے اس فن کی باریکیاں بھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا افتنار بہت جدید شاعری بھی اکثر میری سمجھ میں نہیں آتی جدید مصوّری اور بُت گری کیا سمجھ میں آئے گی۔ قتیل نے افتنار کے مطالعے کی داد دیتے ہوئے کہا کہ افتنار ان مجسموں سے خوب معانی نکال رہا ہے۔ ضمیر جعفری کہنے لگے کہ ان فن پاروں سے معانی تو کیا نکلیں گے ہاں ان میں معانی ڈالے جا سکتے ہیں۔ بہر طور وہاں سے چلتے وقت یہ خواہش دل میں ہزور موجود تھی کہ کاش اس فن کو میں اس طرح سے سمجھ سکتا جس طرح افتنار نے سمجھا ہے یا، میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اصل میں اس آرٹ کے بارے میں مطالعے کی مجھے زندگی میں فرصت ہی نہیں ملی۔ اگر تین چار اچھی کتابیں اس موضوع پر نظر سے گزر جاتیں تو شاید میں اس سے بھی اسی طرح لطف انداز ہو سکتا جس طرح چفتائی کی پاروی درما کی تھویر کشی سے لطف انداز ہوتا ہوں یا اجتنا اور ایلو را کی نقاشی اور بُت تراشی سے۔

ان فن پاروں کو دیکھنے کے بعد مجھوں کی محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ افتنار اپنی لے کے اپنے گھر پہنچے۔ وہاں دودھ اور آنس کریم سے ہماری تواضع کی کسی اور ہم تازہ دم ہو کر پھر سیر کو نکلے۔ رستے میں ضمیر جعفری نے مجھ سے اپنے پرانے دوستوں کے بارے میں پوچھا۔ سب سے پہلے انھوں نے پریم بھائیہ کا ذکر کیا اور مجھ سے پوچھا کہ آپ انھیں جانتے ہیں۔ میں نے کہا میرے عزیز دوست ہیں اور میں نے ان کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی داستان کہہ سنائی۔ پریم بھائیہ اور ضمیر جعفری شاید سنگاپور میں اکٹھے رہ پچکے تھے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں۔ میں نے انھیں بتایا کہ پرتم بھائیہ سنگاپور میں ہمارے سفارجھی رہ پچکے ہیں اور اب ٹریبون (چند تی گڑھ) کے اڈیٹر ہیں۔ ٹریبون کا ذکر آتے ہی لا ہو رکی داستان چھڑکی اور کابین ناترے۔ شر اجن، او نیا شش چند رہانی روڈ پارک پلینگ اور میاں محمد شفیع کے زمانے کی صحافت کی یاد تازہ ہو گئی۔ ضمیر جعفری نے کہا کہ ہندستان واپس پہنچ کے پریم بھائیہ اور پردیسرا ایش کمار تک میرا اسلام پہنچا دینا۔

ضمیر جعفری نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے "اردو پنج" کے نام سے ایک سو ماہی جریدہ نکالا ہے اور مجھ سے فرمایش کی کہ ہندستان کے ادبیوں اور شاعروں کے کچھ مزاجیہ واقعات

اس جریدے کے لیے انھیں بھجوں۔

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم شکاگو پبلک لائبریری کے آگے سے بھی گزرے اور آرٹ انٹری ٹاؤن اف شکاگو کے سامنے سے بھی۔ کچھ اور عمارتیں بھی دیکھیں اور اس سے قبل کہ ہم مشیکن جھیل کا رخ کرتے فردوسی صاحب اور افتخار ہمیں کھانا کھلانے کے لیے لا ماگر ڈینا نامی ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ یہ ایک میکسیکن ریسٹورنٹ تھا۔ اور اس میں ہم نے میکسیکو کا کھانا کھایا۔ امریکی اور یونانی کھانے کی طرح یہ بھی بہت لذیذ تھا۔ ایک دش کو چکھتے ہی قتیل نے کہایہ تو حلیم ہے۔ اسے کھایا تو واقعی حلیم سا ذائقہ تھا بلکہ ہمارے حلیم سے زیادہ لطیف تھا۔

اب دوپہر ڈھل رہی تھی اور ہم جھیل کی سیر کو نکلے۔ جھیل کا پانی تو ساکن تھا اسکن اس کے کنارے کنارے پنج BEACH پر انسان اور با شخص صوص نسوانی خُسن کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ سمندر کی میل تک چلا گیا تھا۔ ہر رنگ و نسل کی نیم عریاں بلکہ نیم عریاں سے بھی زیادہ عریاں، زیادہ تر غسل ہی کے باس میں ڈالکیاں اور عورتیں جنت نکاہ تھیں۔ بوس و کنار کے مناظر بھی دیکھنے میں آئے۔ غالب تکتے تک ہی پہنچ تھے اور ناز نین تباں خود اڑا کو دیکھ کر انہوں نے دوچار شورا یے کہ دیے تھے جو آج تک اردو شاعری میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ یہ منظر دیکھتے تو نہ جانے ان کے قلم سے کیا کیا گوہرا بدار نسلتے۔

اب شام ہو چلی تھی اور ہم لوگ بھی تھاکر چور ہو چکے تھے چنانچہ راما ڈاون کو واپس ہوئے۔ وہاں قتیل اور ضمیر جعفری کو خدا حافظ کہا اور فردوسی صاحب مجھے ڈاکٹر خورشید ملک کے دولت کے پر لائے جہاں وہ تھوڑی دیر پڑھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر خورشید ملک کے ساتھ ناشستے پر یادن کے کھانے پر یارات کے کھانے پر اکثر ڈاکٹر ٹائم عاجز کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ ابھی تین روز قبل ڈاکٹر خورشید ملک نے بتایا تھا کہ بمی سے ان کا ایسی فون آیا ہے اور کہتے ہیں کہ ایرانڈ یا کے طیارے میں جگ نہیں مل رہا ہے۔ ڈاکٹر خورشید نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ کسی اور طیارے میں ریز روشن کی کوشش کریں۔

آج جب ہم کھانے پر بیٹھے تو ڈاکٹر خورشید ملک نے ان کا ایک خط دکھایا جو اج

کو لمبیں کے دلیں تھیں

جسکے لئے ملا تھا سیکن بہت دن پہلے کا لکھا ہوا تھا اور جس سے یہ پتا نہیں چل سکتا تھا کہ وہ بمبئی سے چل پڑکے ہیں یا نہیں۔ یہ خط پڑھنے کے بعد ہم کافی دیر تک ٹھنڈی کا ذکر کرتے رہے اور اس نتیجے پر آپنے کہ ایک آدھ دن میں وہ شکا گو پہنچ جائیں گے کیونکہ کھر سے چل پڑکے ہیں اور زمینی تک آگئے ہیں۔

(۱۳)

پھر ایک دن آرام کا

آج باہر کا کوئی پروگرام نہیں تھا اور چونکہ کل کادن خاصاً تھیں کہا دن تھا اس لیے سوچا آج کھر میں بیٹھ کر آرام کروں۔ زیرِ تحریر سفر نام بھی کچھ مکمل ہو جائے گا اور لندن نیو یارک، جہوں، سری نگر اور دہلی خطوط بھی لکھ دوں گا سیکن جمیل الدین عالی سے کل دن بھر ملاقات نہیں ہوئی تھی اور مشاعرے کی ملاقاتوں کوئی ملاقات نہیں تھی۔ ڈاکٹر خورشید ملک اس وقت تک ہسپتال جا پڑکے تھے چنانچہ نیشنل بنک اف پاکستان میں ٹیلی فون کیا پتا چلا کہ عباسی صاحب اور عالی صاحب کھر سے چل پڑکے ہیں اور کوئی آدھ تھنڈے میں بنک پہنچنے والے ہیں۔ میں نے عباسی صاحب کے سکریٹری کو اپنا ٹیلی فون منزد دیا کہ جبکہ عالی صاحب آئیں تو انھیں میرا پیغام بھی دے دیں اور یہ ٹیلی فون نمبر بھی۔

میں میرے لیے صبر مشکل ہو رہا تھا تھا میں چالیس منٹ گزرنے کے بعد پھر ٹیلی فون کیا۔ عالی لائن پر تھے۔ کہتے لگے وہاں آئے ایک ہی منٹ ہوا ہے اپ کا فون ملاسہ ہے اور میں ٹیلی فون کرنے ہی والاتھا۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان کے شرکی رو انگل کا وقت ۳ بجے ہے۔ اس وقت انہی گیارہ ہی بجے تھے۔ ٹیلی فون پر عالی صاحب سے جی بھر کے باہم ہوئی گذشتہ سی میں جب میں کہاچی میں تھا تو عالی کویت گئے ہوئے تھے۔ عالی نیشنل اف

پاکستان کے ڈپٹی جنرل مینجر ہیں اور بہ کار پر سرکار اکثر دوسرے ملکوں میں گھوستے رہتے ہیں۔ امریکہ بھی وہ اس سے قبل کئی بار آپھکے ہیں۔

عالیٰ صاحب نے دسمبر میں کراچی آنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت مولوی عبد الحق تو سیمی سیکپروں کے سلسلے میں تھی۔ عالیٰ الجمن ترقی اردو پاکستان کے جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ یہ دعوت انہوں نے اس حیثیت سے دی۔ عنوان تو نہیں لیکن موضوع انہوں نے خود جو یہ سیکپر کا موضوع انہوں نے اقبال کا فکر یافن تجویز کیا اور دوسرے کام مردم شخیضت کیے۔ ایک کا موضوع انہوں نے سیکپر کراچی میں بھی ہوں گے اور لاہور میں بھی۔ ساتھ قبول کی۔ انہوں نے کہا یہ دونوں سیکپر کراچی میں بھی ہوں گے اور لاہور میں بھی۔ مجھے اس کے سوا اور کیا چاہیے تھا۔

خَابِ وَطْنَ اَزْمَلَ سَلْمَانَ خُوشَرٌ خَارِدَ طَنَ اَزْسَبِيلَ دَرِيَمَاںَ خُوشَرٌ
يُوسُفَ كَهْ بَهْ مَهْرَ بَادَشَا هَيْ مَيْ كَرَدَ مَيْ لَكْفَتَ كَمَدَ بَوْدَنَ كَسْنَاںَ خُوشَرٌ
شَكَأُو بَسَ جَبَ مِسَّاگْرِيْسَ لَكْنَهَنَ پِرْ حَصَنَهَنَهَتَاهُونَ تَوْدَا كَمَرَخُورَشِيدَ مَلَكَ كَجِيَوْنَگَ سِيَ
پَتَقَ دِيَبا اکثر میرے کرے میں آنکھلتی ہے۔ دیبا بہت پیار میں پتی ہے۔ نہنیٰ نہنیٰ گڑیا سی۔ بہت پیاری بائیں کرتی ہے۔ وہ ایک چوہے کی کہانی اکثر مجھے سناتی ہے جو اس سے چیونگ کم مانگنے آیا تھا لیکن دیسانے اسے چیونگ کم نہیں دی تھی۔ پھر ایک روز اس چوہے کی اتمی آنی وہ بھی چیونگ کم یعنی آئی نہنیٰ لیکن وہ بھی ناکام واپس لوٹی۔

اس چوہے کا حافظہ بہت تیز معلوم ہوتا ہے۔ چیونگ کم مانگنا بھوتا ہی نہیں۔ اور اگلے دن تو اپنی حدود سے بہت ہی بڑھ کیا۔ مجھے سے اُکے کہنے لگا کہ میں دیبا کی گاڑی یعنی آیا ہوں تاکہ اس میں بیٹھو کے شکاگوی سیر کے لیے جاؤں۔ دیبا کو جب میں نے یہ بات بتائی تو اس نے گاڑی بڑی حفاظت سے بند کر کے رکھ دی۔ اس کے بعد دیبا کو بار مجھ سے پوچھ چکی ہے کہ وہ چوہا آیا تھا یا نہیں۔ لیکن چوہا چونکہ چیونگ کم اور گاڑی دونوں سے ماں اوس ہو چکا ہے اس لیے اب بہت دن سے نہیں آیا۔

دیبا کے بھائی تنور اور نوید ماثر اللہ نویں اور پاپوں میں درجے میں پڑھتے ہیں۔ جب میں شکاگو آیا تھا تو یہ دونوں بچے ایک غلیمی کمپ میں شرکت کے لیے وسکانس لگتے ہوئے تھے۔ انہی پرسوں ہی واپس آئے ہیں۔ میں ان سے ملا تو جی خوش ہو گیا۔ خدا

کے فضل و کرم سے تینوں بچے بہت خوش تجیز، مودب اور فرماس بردار ہیں۔ تینوں اپنے والدین کی طرح صاف اور شستہ اردو میں بات کرتے ہیں۔ ان کی پروشن بفضل خالص پندتائی بچہ اور اسلامی بچہ ہیں ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر خورشید ملک نمازوں کے پابند ایک ثقہ انسان ہیں۔ ہماری نئی نسل کی پروشن جب اس ماحول میں ہوگی تو اُمیڈ ک جاسکتی ہے کہ امریکہ ایسے ملک میں بھی ہمارے بچے آپنے ملک اور اپنے مذہب کا چراغ روشن کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

جب روز سے میں ڈاکٹر خورشید ملک کے گھر میں مقیم ہوں اس روز سے تین چار روز قبل ان کے بھیجے ضمیماں ملک کی مستقل رفاقت مجھے حاصل تھی۔ ان کا مرہ بھی میرے مکرے کے ساتھ ہیمنٹ ہی میں تھا اب وہ تین چار روز سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ پتا چلا کہ پھر دنوں کراچی میں ان کی شادی ہوئی تھی اور اب وہ اپنی دلھن کو لانے نیویارک گئے ہوئے ہیں۔ آج ہی وہ اپنی دلھن کو لے کر نیویارک سے واپس آئے ہیں۔ پہنچی جس کا نام غایب ہے شروع ادب کا بہت عمدہ اور شستہ مذاق رکھتی ہے۔ ان سے مل کر کے دل مسرت ہوئی۔

آج شام کو ڈاکٹر وصی اللہ خاں بونی ورستی کے بعض انتظامیہ امور کے متعلق بات چیت کرنے کے لیے ڈاکٹر خورشید ملک کے بہان تشریف لائے۔ جب وہ اس سے فارغ ہوئے تو میز پر کھانا ملک گیا۔ اسی دوران میں نیلی فون کی گھنٹی بھی۔ یہ ڈاکٹر کلیم عاجز کا فون تھا۔ شکا گوا ایر پورٹ سے۔ لیکن ان کے آنے سے جو خوشی ہوئی وہ ایک لمجھے ہی میں ختم ہو گئی کیونکہ انھیں ایمیگریشن والوں نے ایر پورٹ پر روک لیا تھا۔ نہ جانے ایمیگریشن والوں کو کیا خلط ہے میں ہوئی کہ ڈاکٹر خورشید ملک کے بار بار یہ کہنے کے باوجود کہ یہ بونی ورستی میں ریڈر ہیں، شاعر ہیں، میری دعوت پر شکا گوا آئے ہیں انہوں نے کلیم عاجز صاحب کو کہنڈی میں لے لیا اور کہا کہ مکالم انھیں عدالت میں پیش کیا جائے گا اپ اس وقت آجائے گا۔ ساتھ ہی ایمیگریشن والوں نے یہ یقین بھی دلایا کہ کہنڈی میں انھیں کوئی زحمت نہیں ہوگی انھیں ایر کہنڈی پیش کرے میں ٹھہرایا جائے گا اس میں ریڈ پوسٹ ہو گا، نیلی دیڑن سیٹ ہو گا۔ ملختہ بالکل دو گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کہنڈی تو اس فرکشہ دی ہے ہم سب اس اعلان سے افرادہ خاطر ہو گئے۔

اس ماہی کے عالم میں ڈاکٹر خورشید ملک، ڈاکٹر وصی اللہ خاں اور ضیا ملک صاحب فوراً گاڑی میں بیٹھ کے ایر پورٹ کو روانہ ہو گئے تاکہ امیگریشن کے افسروں سے بات کر سکیں لیکن جب وہ دہاں پہنچے تو امیگریشن کے مذکورہ افسروں کے تھے اور ڈاکٹر کلیم عاجز کو ایک ایسے ہوٹل میں پہنچایا جا پھر کا تھا جو اسی مقصد کے لیے مخصوص ہے اور جس کا نام اور پتا صیغہ راز میں رکھا گیا ہے۔

(۱۵۱)

ڈاکٹر کلیم عاجز

رات بہت دیر تک نیند نہ آئی اور جب آئی بھی تو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد آنکھ کھل جاتی تھی۔ خیالِ اصل میں ڈاکٹر کلیم عاجز کی طرف تھا کہ نہ جانے کریڈٹ میں اُن کی رات کیسے بسر ہوئی ہوگی۔ انھیں آج سازھے نوبھے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ ڈاکٹر خورشید ملک اور ڈاکٹر وصی اللہ خاں نے رات بھی رات بھی ایک امریکن وکیل کا انتظام کر لیا جو عدالت کے کھلتے ہی کلیم عاجز کی طرف سے پیش ہو گیا اور امیگریشن والوں کی غلط فہمی دور کر کے انھیں رہا کرائے آیا۔ معلوم ہوا کہ انھیں رہا کرتے وقت غلط فہمی کاشکار ہونے والوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور معذرت پڑھا ہی۔ یہ امریکی کردار کا ایک بلند پہلو ہے۔

مجھے برلن میں فون پران کی رہائی کی خبر کا انتظار رہا۔ آخر کوئی بارہ بجے کے قریب ڈاکٹر خورشید ملک کا میلی فون آیا کہ سب کام تھیک ہو گیا ہے اور ڈاکٹر وصی اللہ خاں دو تین بجے تک کلیم عاجز صاحب کو اپنے ساتھ لے کر گھر پہنچ جائیں گے۔ انھیں بخار تھا پناپنے ڈاکٹر خورشید ملک کی بیکم نے انھیں دوادی۔ انھوں نے ناشستہ کیا اور ساتھ ہی ساری رواد بھی سناتے رہے، میں نے رسیدہ بود بلائے دلنے بغیر گذشت، کہ کراطیں ان کا

سنس پا۔

میں نے آج تقریباً سارا دن چارلس ایم اینڈ ریوز کی تصنیف

The Colonial Back - ground of the American Resolution کے مطابعے میں گزارا

پچھے خطوط بھی لکھے اور اس طرح سے دن بسر ہو گیا۔
ڈاکٹر کلیم عاجز نے دن بھر آرام کیا۔ بلکہ نیند کی گولی کھائے وہ سوئے رہے۔ رات
کو وہ جا گئے تو ان کی طبیعت خاصی بحال ہو چکی تھی اور ان کی بات چیت میں وہ تکذیر بھی
نہیں جھدلتا تھا جو ایر پورٹ کے واقعے نے پیدا کر دیا تھا۔

(۱۶)

آرٹ انسٹی ٹیوٹ آف شکاگو

پرسوں انجاز نسرين کا ٹیکنیک فون آیا تھا کہ بدھ کے روز ہم پھر اکٹھے ہوں گے اور
دن بھر سفر میں بسر کریں گے۔ چنانچہ آج صبح انجاز نسرين، نسیم سرور، ان کا پچھے ار معان
اور ریاض فرحت بخاری تشریف لائے اور یہ قافلہ پھر شکاگو کی سیر کو نکلا۔ اب کے ہماری
پہلی منزل Planetarium میں اس سے قبل لندن اور
بھی میں دیکھو چکا تھا اس لیے اب اسے تفصیل سے دیکھنے کی خواہش نہیں تھی لیکن اس
کے باوجود بھائی گھنٹہ ڈپڑھ گھنٹہ صرف ہو ہی گیا۔

یہاں سے ہم لوگوں نے کارخیلہ کا شمار یقیناً دنیا کے بڑے بڑے آرٹ انسٹی ٹیوٹس میں ہے۔

اس طرح کے نمونے میں ہمہ بھی لندن، پیرس، قاهرہ، ماسکو، یونان گراڈ، زیگنا
اسٹیفنڈ اور میڈرڈ میں دیکھو چکا ہوں۔ کس کو کس پر ترجیح دی جائے یہ تو ذرا مشکل ہے
لیکن یونان گراڈ کے ونڈ پیلس کا خیال آتا ہے۔ تو آج بھی آنکھوں میں چکا چوند کا عالم

پیدا ہو جاتا ہے۔

شکاگو کے آرٹ انٹی ٹیوٹ میں راجستھانی آرٹ کے متعدد نمونے دیکھئے۔ جب پورے کا آرٹ اس میں بہت نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میواڑ کا فنِ تصویر بھی موجود تھا۔ رامائن کی تصویریں خاصی دلکش تھیں۔ ایک سینکشن کا عنوان تھا

The Search Alexander

تمہلے تو عنوان نے ذراً الجھن میں ڈالا لیکن جب اس شبے کے نوادر کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو بات کم بھی میں آگئی۔ یہ دراصل اُن مقامات اور نشانات کی تلاش تھی جن سے سکندرِ اعظم کا بھی کوئی تعلق رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی ابتداء تو مقدونیہ سے ہوئی لیکن یہ تلاش آج تک جاری ہے۔ بعض ایسے نوادر جن سے سکندرِ اعظم کا تعلق رہا ہے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۷ء میں وسیع ہوئے۔

اسی بحث کے بعد جاری ہوا ایک خوبصورت مجسمہ دیکھا جو ۱۹۴۵ء کی تدبیق ہے۔ یہ ایک عورت کا مجسمہ ہے جو عالمِ خواب میں ہے۔ اس طرح کے خوبصورت مجسموں اور تصویروں سے یہ آرٹ گیلدری مسحور ہے لیکن اس آرٹ گیلدری کو دیکھنے جو مخلوق آئی ہے اس میں بھی آرٹ کے خوبصورت نہ نہیں ہوتے۔

یہ تو خیر آرٹِ انٹی ٹیوٹ کی بات تھی جس کے اکثر حصہ حیرت خانہ تھے لیکن شکاگو آنے کے بعد عام زندگی میں اس طرح کے مشاہدے کم نہیں ہوتے تھے جس سے امریکہ واقعی بحاسب کھو نظر آیا۔ مثلاً ایک روز میں ڈاکٹر خورشید مدنگ کے ساتھ گاڑی میں جا رہا تھا دیکھا کہ ایک مکان کی بنیاد میں کھود رہے ہیں۔ پتا چلا کہ اس مکان کو نرک پر رکھ کر کبیس اور جگہ لے جائیں گے جہاں یہ اسی طرح ڈرک سے اُتار کے رکھ دیا جائے گا۔

ایک دن قبیل اور میں افتخار کے کھر میں بیٹھتے تھے۔ افتخار کا مکان تیسرا منزل پر ہے۔ ان کے ایک ملائقاتی نے گراؤنڈ فلور پر آ کر ان کے مکان کی گھنٹی بجائی۔ افتخار نے اپنے ٹیلی ویژن سٹ کا ایک ٹین دبایا اور گھنٹی بجانے والے کی تصویر ٹیلی ویژن پر آگئی۔ اس کی تصویر دیکھ کر افتخار نے وہیں اپنے کمرے میں کسی دیوار کے قریب جا رکھا را جو آجا وہ اس پر پتھے کا دروازہ کھل گیا اور تھوڑی دیر میں راجویعنی ریاض احمد اندر آگئے۔ یہ امریکہ

یہ فرد کی زندگی کے تحفظ کا ایک پہلو تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے ڈاکٹر خورشید ملک کے گھر میں سیٹی بھنا شروع ہوئی۔ پتا چلا کہ کچن میں ذرا سادھواں ہے اور ایک آلہ گھر کے وگوں کو خبردار کر رہا ہے۔ یہ خود اس وقت بھین میں موجود تھا، نہ تو مجھے دھواں نظر آیا بلکہ اس کی بوناک میں آئی لیکن یہ آلہ اس قدر حساس تھا کہ دھوئیں کے شابے بنک کو اس نے گوارا کیا۔

ایک روز افتخار کے ساتھ میں ان کی گاڑی میں بیک مشیگن کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ سامنے جھیل میں جو سمندر کی طرح دکھائی دیتی ہے پچھے جہاز نظر آئے جنھیں میں کسی روز سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے افتخار سے کہا یہ عجیب جہاز ہیں تین چار روز سے میں انھیں پانی میں اسی جگہ دیکھ رہا ہوں۔ پتا چلا کہ جہاز نہیں ہیں بلکہ مشینیں ہیں جن میں بعض جھیل میں سے پانی نکال کے شکاؤ کے شہر کو مہیا کر رہی ہیں اور اس پانی کو شہر تک پہنچنے سے پہلے صاف کر رہی ہیں۔ سمندر کے اندر پانی نکالنے اور پانی کو صاف کرنے کی مشینیں دیکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

اسی سیر کے دوران میں افتخار نے مجھ سے پوچھا اپ کی شمس الرحمن فاروقی سے تو ملاقات رہتی ہو گئی میں نے کہا جی ہاں کبھی کبھی۔ جب دہلی جاتا ہوں یا کسی سیمنار میں ہم دونوں موجود ہوں مثلاً اقبال، نشی ثبوت یونیورسٹی آف کشمیر کے دو سیمناروں میں ہماری اپس میں ملاقات ہو چکی ہے کہنے لگے اب ملاقات ہو تو میرا محبت بھرا سلام آن سے کہنا۔ افتخار کے اس حسن انتخاب سے میرا دل خوش ہو گیا۔

آرٹ انسٹی ٹیوٹ کی سیر کے بعد ہم لوگ نیم مرد کے مکان پر پہنچے جہاں انگیاز بیٹھنے والی دیڑن دیکھتے رہے۔

آج رات کا کھانا ملک سعیدی صاحب کے ہاں تھا۔ ملک سعیدی شرکتے ہیں اور امریکہ میں اردو کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی دعوت حسب معمول شروع سخن میں تبدیل ہو گئی جس میں انور خالد، عبداللہ غازی، افتخار نیم، عبد الوحد فریدی، ڈاکٹر یکیم عاجز اور راقم التحریر نے اپنا کلام سنایا۔

(۱۷)

ڈاکٹر وصی اللہ خاں کے ساتھ چند لمحے

آج دن میں کوئی پروگرام نہیں تھا۔ گھر ہی پر رہے۔ رات کی دعوت ایسٹ ویسٹ کی دین آف اکیڈمک انیز ڈاکٹر مدھو جین کے طرف سے تھی۔ ڈاکٹر وصی اللہ خاں مجھے اور ڈاکٹر کلیم عاجز کو ساتھے کر ڈاکٹر مدھو جین کے دولت کدے پر پہنچے۔ ڈاکٹر مدھو جین اور ان کے شوہر ڈاکٹر سبھاش جین بڑے پاک سے ملے۔ ان کے یہاں طرح طرح کے انتہائی لذیذ سالنوں پر مشتمل فرجی ٹرین لکھانا کھایا اور پھر ڈاکٹر وصی اللہ خاں کے ساتھ ہم لوگ ڈاکٹر خورشید ملک کے مکان پر واپس آئے۔

ڈاکٹر وصی اللہ خاں انسائیکلو پیڈیاٹیک علم کے مالک ہیں۔ اقتصادیات کے اکثر اعداد و شمار انھیں حفظ ہیں جن سے نکلے ہوئے معنی خیز نتائج ان کے سامنے رہتے ہیں۔ آج مجھے اور ڈاکٹر کلیم عاجز کو ڈاکٹر مدھو جین کے دولت کدے پرے جاتے ہوئے بھی اور واپسی پر بھی انہوں نے بات چیت میں علم کے دریا بہار پئے تھے، انہوں نے بتایا کہ شکاگو شہر کا بجٹ سارے ہندستان کے بجٹ سے زیاد ہے۔ میں یہ سن کر غرق ہجرت ہو گیا۔ بس اقتصادی طور پر ہم یہاں ہیں کہ امریکہ کا ایک شہر ہمارے سارے ملک سے اگے بڑھ گیا ہے سیکن میری ہجرت یا میری مایوسی صورت حال کو بدل نہیں سکتی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی اور اس سے دوچار ہوئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر وصی اللہ خاں کی زبانی بتایہ چلا کم ۱۹۷۸ میں ہندستان کی آمدی ۸۴ ملین ڈالر تھی اور ۱۹۹۰ میں شکاگو شہر کی آمدی ۲۹ ملین ڈالر تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ امریکہ اور روس کی پیداوار میں سم اور اکا تناسب ہے۔

اس کے علاوہ جہاں تک تحلیم و صحبت کا تعلق ہے انہوں نے انہیں مالک کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعے کا پنجواں انہوں نے رات کی بات چیت میں ہم لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔

تاریخ، اقتصادیات، سماجیات اور سیاسیات کے متعلق ان کا علم میرے یہی باعثِ حیرت بھی ہے اور باعثِ رشک بھی۔ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی خوش نصیب ہے کہ اُسے ایسا چانسلر ملا ہے۔

(۱۸)

اسلامک سنٹر اف شکاگو

آن صبح میں اور ڈاکٹر کلیم عاجز ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ڈاکٹر عبداللہ غازی حب و عدہ تشریف نے آئے اور ہم دونوں کو شکاگو کے اسلامک سنٹر میں ملے گئے۔ اس کا نام ہے Islamic Centre Down Town میہاں اسلامک سنٹر کے امام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آن کا نام ہے محمد نور۔ سودانی ہیں اور مسلمہ جمیعت کے عالم ہیں۔ اسلامک سنٹر کے سکرپٹری سے بھی ملاقات ہوئی۔ آن کا نام ہے رمضان ویرمی اور یہ فلسطینی ہیں۔ دونوں حضرات دیر تک ہندستان اور پاکستان کی باہمی دوستی کی اہمیت پر بات پیچیت کرتے رہے۔

وہاں سے ہم و گوں کو شہر کے مختلف حصے دکھانے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ غازی اپنے مرکان پر لے گئے۔ وہاں ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے پر چند احباب اور بھی تھے۔ ملک سعیدی بھی۔ ڈاکٹر عبداللہ غازی کی لا بَرْزَرَی دیکھی۔ اپنے ہی لھر کا نقشہ تھا لیکن کمرے اور ریکوں کی نفاست میہاں کی گنازی پر یادہ تھی۔

رات کو کھانا جید را سامن صاحب کے دولت کدرے پڑھا۔ آپ کا تعلق لاہور سے ہے اور میہاں آپ انجینئر ہیں۔ ان سے اور ان کی بیگم ثمینہ سے فردوسی صاحب کے دولت کدرے پر ملاقات ہو چکی تھی۔ دوبارہ ملاقات باعثِ مرتضیٰ ہوئی۔ ثمینہ بیٹی نے میرے یہی خاص طور سے مرتجع کے بغیر کھانا تیار کیا تھا لیکن ہوا یوں کہ غازی صاحب کے دہان بہت دیر میں

کھان لکھانے کے باعث رات کو اشتہا ہی محسوس نہ ہوئی اور میں جید رام صاحب کے یہاں کھانے میں شریک نہ ہو سکا جس کا مجھے افسوس ہے بالخصوص اس لیے کہ تمینہ نے خاص طور سے مریج کے بغیر لکھانے کا اہتمام کیا تھا۔

کھانے کے بعد دیر تک ان کے یہاں شعرو شاعری کی محفل جمی رہی۔ ملک سعیدی، عابد اللہ غازی، عبد الوہید فخری، ڈاکٹر کلیم عاجز اور راقم التحریر نے اپنا کلام سنایا۔ کوئی سازھے بارہ بجے یہ محفل اختتام پذیر ہوئی اور حب جید صاحب نے مجھے اور ڈاکٹر کلیم عاجز کو ڈاکٹر خورشید ملک کے دوست کردے پڑھنچایا تو ایک بحچ چکا تھا۔

(۱۹)

ذکرِ اقبال

یہ شاید میں چھٹے کہیں لکھوچ کا ہوں کہ آج کی تاریخ (۱۵ ستمبر ۱۹۸۱) ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں علامہ اقبال پر میرے پیکھر کے لیے طے ہوئی تھی۔ پیکھر کا وقت دن کے بارہ بنکے تھا۔ گیارہ کے قریب امتیاز صاحب جو یہاں ایک الجیزیرہ میں اپنی بیکم صاحبہ کے ہمراہ تشریف لائے اور مجھے اور ڈاکٹر کلیم عاجز کو اپنے ساتھ یونیورسٹی میں لے گئے۔ ان کی بیکم لشیر سے ہیں اور ان کا تعلق وہاں کے نقشبندی خاندان سے ہے۔

میرے پیکھر کا موضوع تھا "اقبال: ایک آفیقی شاعر" صدارتیہ یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر وصی اللہ خاں نے کہ مقام کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔

پیکھر سے قبل پروفیسر عابد اللہ غازی نے میر اتعارف کرایا اور کچھ ناچیز کے علمی اور ادبی کام کو بہت توجیف اور توصیف کے ساتھ بیان کیا۔ انہوں نے میری اندر کتابوں میں مندرج مباحثت تک کا ذکر کیا۔ ظاہر ہے یہ ان کی دوست نوازی تھی اور بقول اقبال

کیا میری بساط ہے جہاں میں بس ایک فنان زمرہ با می

نامہب نہیں متاعِ گفتار صدر انوری و ہزار جامی
پیکھا اور سوال جواب کا سلسلہ کوئی تین بجے ختم ہوا۔ اس وقت تمام مہماںوں کی
تواضع چاہے اور امریکیں مٹھائی سے کی گئی جس کے بعد ڈاکٹر کلیم عاجز اور راقم التحریر کو ملک سعیدی
اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ ڈاکٹر عابد اللہ غازی اور ڈاکٹر علی حقانی بھی ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر علی حقانی
نے اُسی شام کو سکاروں کا تخفہ عنایت کیا جوان سکاروں سے کہیں بہتر تھے جو میں ہندستان
سے اپنے ساتھ لے کر کیا تھا اور جن کا ذخیرہ اب ختم ہو گیا تھا۔

دو پھر ملک سعیدی کے دولت کے پر سبر ہوئی۔ ملک سعیدی اور ان کی بیگم
شہنماز صاحبہ کی مہماں نوازی ہمیشہ ایک یادِ حسین کی طرح دل میں رہے گی۔ انہوں نے بھی
تحائف کے بغیر گھر سے روانہ نہیں کیا۔

رات کے کھانے کی دعوت ایک ہندستانی ہوٹل شایمار کی طرف سے تھی۔ اس
کے مالک نجم الدین صاحب علی گڑھ مسلم یون و رستی علی گڑھ کے فارغ التحصیل طالب علم
ہیں۔ یہاں اجنبیز ہیں۔ فارغ وقت میں ہوٹل چلاتے ہیں۔ انہوں نے بہت عمدہ کھانا کھلایا
میرے لیے دو ایک سالن انہوں نے خاص طور سے مرچوں کے بغیر تیار کرائے۔

وہاں سے مہماںوں کا قافلہ ایسٹ ویسٹ یون و رستی کو ردانہ ہوا۔ یہاں رات کو
میری صدارت میں ایک مشاعرہ تھا۔ اس میں عابد اللہ غازی، خالد خواجہ، خالد انور، عترت
حسین، ملک سعیدی، روف راہی، افتخار نیسم، کلیم عاجز اور راقم التحریر نے اپنا کلام
سنایا۔ تمام شراکا کا کلام بہت عمدہ اور معیاری تھا۔ خواجہ خالد کے دو شعراں وقت
یاد رہ گئے ہیں۔

صورت میں وہ ڈھونڈوں جو شناسا بھی نہیں ہے
اس وقت زور میری کہانی میں آئے گا
رتا ہوں اس پر جسے دیکھا بھی نہیں ہے
وہ حُسن جب حروف و معانی میں آئے گا

مشاعر سے قبل ڈاکٹر وحی الدین خاں نے یہ مرشد دیا کہ پنلوانیا سے دوبار میرے
لیے ڈاکٹر حفیظ ملک کا نیلی فون بچکا ہے اور انہوں نے اپنے گھر کا نمبر دیا ہے۔ میں نے شکا کو
پہنچنے کے بعد ڈاکٹر حفیظ ملک کو دو خط لکھے تھے اور متعدد بار ان کے ساتھ ٹیلی فون پر

بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کا فون نہیں مل رہا تھا۔ اب جو ان کا ٹیلی فون ملا تو مجھے گویا قاروں کا خزانہ مل گیا۔ میں نے فوراً ہی انھیں ٹیلی فون کیا۔ مل گئے۔ کہنے لگے میں آج ہی ڈل ایسٹ سے واپس آپا ہوں اور آپ کے دونوں خطوط بیک وقت ملے ہیں۔ آپ کو ہر حالت میں فلاڈ لینیا آتا ہے۔ میں نے کہا میں امریکہ کی یونیورسٹیوں کا تصور حفیظ ملک کے بغیر کر رہی نہیں سکتا۔ آپ سے ملاقات کیے بغیر واپس جانے کا سوال ہی نہیں۔ انھیں میں اپنا پروگرام پہلے ہی لکھ جکاتھا۔ وہ اس وقت اُن کے سامنے تھا۔ انہوں نے خود رہنمائی کی اور کہا کہ فلاڈ لینیا واشنگٹن اور نیو یارک کے درمیان واقع ہے۔ آپ واشنگٹن سے نیو یارک جاتے ہوئے میرے بہاں قیام کر دیں۔ میں نے کہا میں پورا ایک دن آپ کے بہاں رہوں گا۔ جنکے کم از کم دو دن رہنا ہو گا۔ آپ کے پروگرام میں اتنی گنجائش نظر اُر ہی ہے۔

میں پروفیسر حفیظ ملک کی اواز پہلی بار سن رہا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک بے بہانہت مل رہی ہو۔ ان کے ساتھ کسی برس سے میری خرط دکتابت تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب Iqbal : Poet Philosopher of Pakistan بھی مجھے

Journal of South East Asian Studies میں بھی دو ایک بار مبڑا ذکر کیا تھا۔ اُن کے ساتھ شروع ہی سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا اور میں نے اپنی انگریزی کتاب Iqbal: Mind and Art کا انتساب اس شرکے ساتھ اُن کے نام کیا تھا

ز جوہرے کہ نہان است در طبیعت ما

پیرس صیر فیاں را کہ ماعیار خود یم

اور اب جو ان سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی تو بے اندازہ مسرت ہوئی۔

ابھی اس ٹیلی فون کا سلسلہ بہت دیر تک چلتا ریکن مشاعرہ شروع ہونے والا تھا۔ میری ہی صدارت میں۔ اس لیے بار بار بلدا اور ہاتھا۔ چنانچہ ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

مشاعرے کے بعد میں نے ڈاکٹر خود شید ملک سے گزارش کی کہ از راہ کرم میرے واشنگٹن سے نیو یارک کے سفر کا پروگرام اس طرح سے بنایا کہ رستے میں کم از کم ایک دن

میں فلاڈ لینا میں ڈاکٹر خفیظ کے ساتھ قیام کر سکوں۔

ڈاکٹر خورشید مدلک اپنی بے اندازہ منظر و فیتوں کے باوجود میرے اور میرے سفر کے پکڑ و گرام کے سلسلے میں اپنا پورا وقت اور توجہ مجھے دے رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی بیکم عارفہ صاحبہ اور بچتے بھی ہر طرح میرے آرام کا فیال رکھ رہے ہیں۔ میرا دل اس سارے گھر کے لیے جذبہ احساس مندی سے متور ہے۔

مشاعرے کے خاتمے پر ہم لوگ گھر جانے لگئے تو بزم خروج کے سکریٹری رووف راہی صاحب نے بزم خروج کی طرف سے دعوت دی اور فرمایا کہ میں بزم خروج کے کسی اجلاس میں تقریر کر دوں یا مقالہ پڑھوں لیکن اب شکا گوئیں قیام قرب ختم تھا اس لیے ان کی فرمائش میں پوری ذکر سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔

(۲۰)

انڈریانا میں ایک دن

اپنے کی ایک متحضریافت انڈریانا میں کل سے ایسوی ایشن ان مسلم شوشن سائنس

کی سالانہ (Association of Muslim Social Scientist)

کانفرنس ہو رہی ہے یہ ایسوی ایشن ۱۹۸۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے اجلاس کا دوسرا سیشن آج تھا۔ اس میں شرکت کے لیے مجھے پروفیسر عہد الوحد خزی نے دعوت دی تھی۔ کل تو میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں اپنے لیکچر کے سلسلے میں معروف تھا آج اس ایسوی ایشن کے اجلاس میں شرکت ممکن تھی۔ میں نے دعوت شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ چونکہ آج کے اجلاس میں ڈاکٹر وصی اللہ خاں کو بھی شریک ہونا تھا اس لیے انڈریانا کے شہر لافیٹ Lafayette میں واقع پرڈو یونیورسٹی Purdu University میں تک پہنچنا تھا جہاں یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے میرے لیے آسان بھی ہو گیا اور ڈاکٹر وصی اللہ خاں کی رفاقت کی بدولت زیادہ

خوشنگوار بھی ۔

لیکن ہوا یوں کہ رات کے مشاہرے کی وجہ سے ڈاکٹروصی اللہ خاں بہت دیر میں اپنے گھر پہنچ اور ہم دونوں طے شدہ وقت 'آنٹھ بنجے صحیح' کے عوض ڈاؤ نزد گرد و سے گپتا رہ بنجے صحیح ہی چل سکے۔ بہر طور سفر شروع ہوا۔ ڈاکٹروصی اللہ خاں نے اپنی بات چیت میں علم و فضل کے دریا بہانا شروع کیے۔ پہلے تو انہوں نے امریکہ کی مڑکوں کے بارے میں بہت بچھ بتایا۔ پھر اس ملک کے individual enterprise ملک میں کوئی پلیننگ کیش نہیں ہے لیکن پلیننگ کا تتجدد جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ پھر یونیورسٹیوں کے نظام کے بارے میں بتایا اور کہا کہ Affiliating Universities کا تصور امریکہ میں نہیں ہے اور راجحی External Universities کے ذریعے برائیٹ طور پر امتحان پاس کیے جا سکیں۔ امریکہ میں صرف دو طرح کی یونیورسٹیاں ہیں:

Teaching and Research Universities (Our Campus)

اور دوسری

multi - Campuses Universities with autonomous Schools of excellence

دوسری قسم کی یونیورسٹیوں کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ جس طرح لندن میں Imperial College of Science and Technology لندن یونیورسٹی کا حصہ ہے لیکن اپنی جگہ multi-campuses ہے اسی طرح سے بہاں بھی autonomous ہے کوئی جگہ Schools of excellence کے ہیں اور طالب علموں کو ڈگری دینے کے مجاز ہیں۔ اسی تعلق سے بات کرتے ہوئے ایسٹ ویس یونیورسٹی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس کے پروگرام میں بھی autonomous Colleges کا قیام شامل ہے اور مستقبل قریب میں جو کالج اس یونیورسٹی میں (مختلف کمپرسوں میں) شامل کیے جائیں گے ان کی تفصیل ہے۔

1. College of Liberal Arts and Sciences
2. College of Engineering and Technology
3. College of Business and Management

اس کے علاوہ اس یونیورسٹی میں کا علم دینے کے لیے بھی ایک

Space Technology

کالج کا قیام زیر غور ہے۔

اس طرح سے باقیت ہوتے ہوئے ہم اندر یانا کی حدود میں داخل ہوئے جہاں ایک بوڑھ پر لکھی ہوئی استقصای پرہ عمارت نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ابھی ہم ایک آدھ میل ہی گئے ہوں گے کہ خوبصورت گھنے جنگل ہمارے سامنے تھے۔ پتا چلا کہ یہ جنگل نہیں ہیں بلکہ ہمہاں کے پارک ہیں اور اس پارک کا نام ہے

Yellow Stone National Park

لیکن میں تو اسے ایک خوبصورت ہر ابھرا جنگل ہیں ہوں گا کیونکہ پارک کا تصور جو جنگلستان ہوں کا پچھا اور ہی ہے۔ جب ڈاکٹر صی اللہ خاں نے بتایا کہ یہ ابھرا جنگل ریاستان میں اکا ہوا ہے تو بات سمجھی میں نہ آئی کیونکہ ریاستان اور جنگل تھوڑی فطرت کے دو مختلف بلکہ متضاد پہلو ہیں۔ نخداں تو میں صحرائے عرب میں دیکھ چکا ہوں لیکن پختستان بھی نہیں تھا بلکہ جنگل نے رہیت کے صحرائے قبصہ جماں کھان تھا اور رہیت کے صحراء تو ہر جگہ یکساں ہی ہوتے ہیں خواہ دہ میرے رہ کپن کی دنیا کھلور کوٹ (پاکستان) کے صحراء ہاں یا بعد میں دیکھے ہوئے راجستان، مصہار اور میتھہ عرب امارات کے صحراء ہوں۔ ہمہاں ڈاکٹر صی اللہ خاں نے جنگل اور صحراء کے اتریع کی بات کی تھی اور یہ راز کھلنے میں دیر نہ ملگی کہ آخر میں جائے کہ جب اس جنگل کا شمالی کنارا دیکھا تو نہ میں سے تین تین چار چار فٹ اونچی رہیت کی تھے راجستان کے صحرائیکی یاد دلار ہی تھی۔ حیرت ہے کہ رہیت میں جنگل کیسے اُگ آیا۔

اب ہماری گاڑی لیک میشیگن کے کنارے تک پہنچ چکی تھی۔ یہ وہی لیک میشیگن ہے جس کے کنارے کا ایک حصہ الی نائے کی ریاست میں ہے۔ ایک حصہ یہاں انڈ بانا میں میرے سامنے تھا۔ اس طرح یہ جھیل جس پر سمندر ہی کا گمان ہوتا ہے پائیج ریاستوں کے کناروں کو شاداب کر رہی ہے۔

شکا گوکی طرح یہاں بھی جھیل کے کنارے پر جس ورنگ کی ایک کامنات آباد تھی۔ حسن صنف نازک کا غسل کے بہاس میں جھیل کے اندر بھی اور کنارے پر بھی جنت نگاہ بننا ہوا تھا۔ میشیگن جھیل تو پُرسکون تھی لیکن جھیل کے کنارے نیم عرباں حسین جھیلوں کے سمندر نے

ایک نموج کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

اس نظارے میں ہم کچھ دوستے اور کچھ اس سے بچتے جنگل میں داخل ہوئے۔ عجیب و غریب منظر تھا۔ کئی موقعوں پر سرو کے اوپرے اور پھے اشجار دیکھ کر کشمیر یاد آگیا اور کشمیر تو اس سفر میں کئی بار یاد آیا تھا۔ از مناظر کو دیکھیں تو کشمیر اسی سبزی میں کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ انتہائی خوبصورت دصتہ۔ اس جنگل میں کئی شرکیں ایسی تھیں جو اوپرے اور پھے پہاڑوں سے گزر کے جھیل کے کنارے جا پہنچتی تھیں۔ دریاۓ داش اپنے خوبصورت ہرے بھرے کناروں کے درمیان بہتا ہوا کئی بار ہمارے قریب سے گزرا اور دو ایک بار ہم بھی اس کے اوپر سے گزرے۔ اس طرح اس سربز و شاداب ماحول میں کوئی دلختنے گزرنے اور جب ہم اس سے باہر نکلنے تو مشینیں شی ہمارے سامنے تھا۔ یہ سانچھے ہزار کی آبادی کا ایک جھوٹا سا شہر ہے۔ بہت خوبصورت، صاف تھا بلکہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جسے ہمارے آنے سے قبل اس شہر کو دھو دیا گیا ہے اور اب یہ دھلادھلا دیا شہر دھوپ میں ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔

یہاں ڈاکٹر صاحب نے ایک ریشورت کے باہر گاڑی روک لی۔ اندر رکھئے۔ کاونٹر پر خوبصورت اور خوش تمیز لڑکیوں کی مسکراہٹ نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے دہان کھانا کھایا اور نازہدم ہو کر پھر سفر کو نکلے۔

رستے میں چانسلر صاحب نے امریکہ کی اقتصادیات اور بالخصوص کاشتکاری پر مبنی اقتصادیات کا ذکر تفصیل سے کیا۔ Dis Economy اور Economy کے مسئلے پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ چونکہ جھوٹے قطعات زمین پر کاشتکاری غیر منفعت بخش ہوتی ہے اس لیے یہاں ایک ایک فرد کے پاس بڑی بڑی زمینیں زبرد کاشت ہیں اور غالباً پانچ سو ایکٹر سے کم زمین کاشتکاری کے لیے غیر منفعت بخش سمجھی گئی ہے۔

اس طرح باتیں کرتے ہم پانچ بجے شام کے قریب پر ڈو Purdue یونیورسٹی جا پہنچے۔ کانفرنس کا سپر کائیشن مشون ہو گیا تھا اور کانفرنس شاپ ایک ڈیڑھ بجے ہی ختم ہو چکی تھی۔ خاصی مایوسی ہوئی لیکن یہ بھی تھا کہ اگر جھیل، دریا، جنگل، صحراء، کھیت اور جھیل کے کنارے کے مناظر سے آنکھیں بند کر کے ہم گاڑی سر پر ڈوڑاتے ہوئے یونیورسٹی پہنچ جاتے تو کانفرنس میں شاید گھنٹے آؤدھ گھنٹے کے لیے شریک ہو جاتے لیکن رستے میں جو کچھ پایا

تحا اُس سے محروم ہی رہ جاتے۔ اب یہ فیصلہ کرنا کہ اس سفر میں کیا کھو یا کیا پایا بہت دشوار ہے۔ اس وقت مجھے اپنا ہی ایک شعر پادا تا ہے۔

اُس جگہ کھونے پانے کا عجائب غریب ہے
ہم نے آکر جس جگہ کھو یا بہت پایا بہت

پرڈیونی درستی Amerیکہ کی ایک اہم یونیورسٹی ہے

اس میں چالیس ہزار طلباء اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ یہ یونیورسٹی ایگر بلکہ اور انہیں نگ کی تعلیم کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اس کا کمپس دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس کے کمپس کی بیان دلاتا ہے۔ ہاروارڈ (Harvard) ییل (Yale) اور پرنسٹن (Princeton) یونیورسٹیاں ہیں جو اجع علم و ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ان میں طلبہ کی تعداد کم ہوتی ہے۔

State University of New York

امریکہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی

ہے جس میں طلبہ کی تعداد پونے دو لاکھ ہے۔

اس طرح اپنی دلائش پاؤں کے ساتھ ہی ساتھ کوئی ایک گھنٹے تک ڈاکٹر و صی اللہ خاں پرڈیونی درستی کے مختلف حصوں کی سیر کرتے رہے اور اس یونیورسٹی کے متعلق بتاتے رہے۔ مجھے بچے کے قریب ہم دہاں سے چلے۔ رستے میں پھر ڈاکٹر صاحب نے ایک ریسٹورنٹ کے باہر گاڑی روکی اور کہا کہ اس ریسٹورنٹ کی آس کریم کا دور دور تک شہر ہے۔ دہاں پیٹھ کے ہم آس کریم سے لطف انداز ہوئے۔ آس کریم تو خیر لاجواب تھی ہی ویٹر بیس کی بات پیٹت میں بھی حلاوات اور شیرینی تھی۔ چلتے وقت دیس سے ڈاکٹر صاحب نے چند سگار لے کر مجھے عنایت کیے۔ عمدہ سگاروں کے تھے جگہ جبلہ سے مل رہے تھے اور سگار عنایت کرنے والوں میں افتخار نیم، احمد خاں، فردوسی، ڈاکٹر علی حق عازم اور ڈاکٹر و صی اللہ خاں سب شریک تھے۔

اس وقت شیام کے کوئی سات نجح چکے تھے اور ہماری گاڑتی اس وقت انڈیانا سے واپس الی ناٹے کو رواں تھی۔

الی ناٹے پہنچے تو ڈاکٹر صاحب ہمیلے اپنے دولت کدے پر لے گئے۔ ہر جگہ کتابوں اور جرائد کے انبار لگے دیکھو کے جی خوش ہو گیا۔ کتابوں کے انبار فرش پر بھی لگتے تھے۔ کاش

اس وقت میری بیوی بھی یہاں موجود ہوتی اور دیکھتی کہ امریکہ میں بھی ایک گھر ایسا ہے جو کتابوں کی بے ترتیبی کے معاملے میں ہمارے گھر کا مقابلہ کر سکتا ہے یا جمیں میں بھی ایک گھر ایسا ہے جو کتابوں کی بے ترتیبی کے معاملے میں دنیا کے ایک اور گھر کا مقابلہ کر سکتا ہے اور وہ گھر امریکہ میں ہے کسی چھوٹے موٹے ملک میں نہیں۔

کتابیں ڈاکٹر وصی اللہ خاں کا اذر رضا بچونا ہیں۔ اس کتابوں سے بھرے ہوئے گھر کے علاوہ ان کا ایک ہی لٹھ کا نام تھا اور وہ ہے یونیورسٹی۔ یونیورسٹی میں وہ صحیح کے آٹھ بجی مل سکتے ہیں اور رات کے دس بجے بھی۔

وہاں انہوں نے اپنے ایک دوست سے ملوا یا جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ ان کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔ تعلیم کے سلسلے میں یہاں آئے تھے۔ اب یہیں ملازمت کر رہے ہیں۔ سُنا ہے اس طرح کی "غیر ملکی" آبادی جواب ملکی بن گئی ہے امریکہ میں سورنی صدھر ہے۔ میں ان کے یہاں تھوڑی دیر بیٹھا اور انہوں نے پوری ہمہان نوازی کا ثبوت دیا۔

یہاں سے چل کے ہم کوئی رات کے گیارہ بجے اپنی قیام گاہ یعنی ڈاکٹر خورشید ملک کے دولت کرے پڑتے ہیں۔ وہاں کھانا کھایا اور ڈاکٹر وصی اللہ خاں واپس اپنے گھر کو روانہ ہوئے جو ڈاکٹر خورشید ملک کے گھر سے تیس پہنچیں میل سے کیا کم ہو گا۔

(۳۱)

کشمیری کھانا اور کشمیری فہود

آج صحیح ٹور و ٹاؤ سے انور صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ ٹور و ٹاؤ میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں افضل امام صاحب کا ٹیلی فون دو ایک روز قبل مل چکا تھا۔ انور صاحب نے اپنا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ "میرا تھاق بھیرہ (پاکستان) تے ہے جہاں آپ زندگی میں پہلی بار مشاعرے میں شرکت کے یہے گئے تھے"۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے

لیکن یہ سب آپ کو کہاں سے معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا میں نے یہ واقعہ کی جگہوں پر پڑھا ہے اور آپ کی کتاب "میرے گذشتہ روز و شب" میں بھی موجود ہے۔ انھوں نے بھیرے کا ذکر کیا تو وہ مشاعرہ جس میں ایک شاعر کے طور پر نہیں بلکہ اپنے والد محترم کے ہمراہ کیا تھا میری نظروں میں پھر گیا۔ ابوالاثر حفیظ جalandھری سے پہلی ملاقات یاد آگئی اور ان کی نظم "میرا سلام لے جا" میرے کا نو میں رس گھونٹنے لگی۔

انور صاحب نے بتایا کہ ٹورڈنٹو کا ملکہ آپ کو بھیج دیا گیا ہے۔ آج آپ ہی امریکن ایر لائنز کوفون کے جس فلائٹ سے چاہیں اپنی بلنگ کرائیں۔ وہاں ۲۳ ستمبر کو انٹی ٹوٹ آن اسٹڈیز ان ایجوکیشن ٹورڈنٹو یونیورسٹی، میں میرے پھر کی تاریخ طے کی گئی تھی اور رات کو مجھے مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔ ان سے میں نے کہا ۳۱ کو میری واپسی ضروری ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ شکا گو اور ٹورڈنٹو کے درمیان کمی پروازیں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ آپ چاہیں تو واپسی کی بلنگ بھی آج ہی کر سکتے ہیں۔

ابھی ٹیلی فون پر بات چیت ختم ہی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر خورشید ملک ہسپتال سے واپس گھر تشریف لائے۔ انھوں نے بتایا کہ آپ کی ٹورڈنٹو کی بلنگ کرادی گئی ہے۔ کل چار بجے آپ امریکن ایر لائنز کی فلائٹ سے ٹورڈنٹو جا رہے ہیں۔ میں نے واپسی کا پروچھا تو بولے واپسی کے لیے ۳۱ ستمبر کو یوناٹڈ ایر لائنز اور ایر کینیڈا کے طیاروں میں آپ کی بلنگ ہے اور امریکن ایر لائنز کے طیارے میں آپ کا نام ویٹنگ سٹ Confirmed پر ہے۔ میں بہت جیران ہوا کہ ایک ہی دن میں یہ تین ٹیکاروں پیس بلنگ کیسی کہنے لگے آپ کی ٹورڈنٹو سے روانگی نہ کرنے ٹیکاروں میں آپ کی بلنگ موجود رہے گی۔

ان میں سے جس کے اوقات آپ کے لیے مناسب ہوں اُسی میں آجائیے۔ میں نے کہا یوناٹڈ ایر لائنز کے اوقات زیادہ موزوں ہوں گے آپ باقی طیاروں کی بلنگ منسون کرادیجیے۔ کہنے لگے اس کی ضرورت نہیں۔ شاید یہ کینیڈا سے واپسی پر آپ کو کسی اور طیارے کا وقت زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ میں یہ سردست کوئی بلنگ کینسل نہیں کرائی جائے گی۔ اور جب کوئی کینسل کرائیں گے تو اس کا مزید روپیا نہیں دینا پڑے گا۔

مجھے یہ سن کر مسترت آیز جرت ہوئی۔ آپ یہ ڈاکٹر خورشید ملک کے تعلقات اور رسون کا نتیجہ تھا تب بھی اور اگر امریکن ایر لائنز کے حسن انتظام کا ایک پہلو تھا تو بھی دونوں

صورتوں میں ایک قابل تعریف بات تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ امریکہ میں طیاروں کی بکنگ اور ہنگ کو منسون کرانے کی یہ آسانیاں سارے ملک میں موجود ہیں۔ کاشش انڈہن ایم لائنز بھی اس انتظام کے محاسن کو اپنا سکتے۔

رات کو کھانے کی دعوت امتیاز الدین صاحب کی طرف سے تھی۔ امتیاز الدین صاحب کا ذکر ایک بار قبل اس مقامے میں آچکا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے اپ انجینئر ہیں لیکن علم و ادب سے ان کا گھر اشفف ہے۔ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں میرا مقالہ سننے کے بعد انہوں نے معنی خیز سوالات کیے تھے اور میں ان کے علم سے متاثر تھا۔ ان کی بیگم کشمیر کی رہنے والی ہیں۔ انہوں نے آج کی دعوت کھانے میں کشمیری کھانے تیار کیے تھے۔ کشمیری کھانوں کی تیاری میں بہت وقت صرف ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس دعوت کی تیاری میں انہوں نے دن کا پیشتر حصہ کچن میں صرف کیا ہو گا۔ بعد میں کشمیری قبوہ بھی موجود تھا جس نے کھانے کی لذت میں اور اضافہ کر دیا۔ ڈاکٹر خورشید ملک ایک ذات کام کے سلسلے میں آج ہشام کے طیارے سے ٹاؤن (کینیڈ) تشریف لے گئے تھے۔ ہم لوگ کھانا کھا پکے تو کینیڈ اسے ان کا سیلی فون آیا۔ انہوں نے اپنے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دی اور بتایا کہ رستے میں ڈاکٹر حکیم عاجز کی کتاب "یہاں سے کعبہ کعبہ سے مدینہ" ان کے زیر مطالعہ رہی اور وہ اس کتاب سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

اس دعوت میں ڈاکٹر وحی اللہ خاں کو بھی شریک ہونا تھا۔ ہم بھی ان کے انتظار میں تھے کہ نوبت یونیورسٹی سے ان کا سیلی فون آیا۔ وہ امتیاز صاحب سے معذرت کر رہے تھے کہ یونیورسٹی کے کام میں گھر ہوا ہوں۔ کھانے پر حاضر ہو سکوں گا۔ آج سارے امریکہ میں جھٹی کادن تھا اور ڈاکٹر وحی اللہ خاں رات کے نوبتے تک یونیورسٹی میں تھے۔ میں نے ان کے اس انہماک کو یونیورسٹی کے مستقبل کے لیے نیک فال تھوڑ کیا۔

دوسرا باب

(۲۲)

شکاگو سے ٹور و نٹو

آج صبح میں تیار ہوئی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا یہ ڈاکٹر ہرنس لال نازنگ کا ٹیلی فون تھا جو ریگا نا سے بات کر رہے تھے۔ انھیں میرے امریکہ آنے کی اطلاع خاصی تا خیر سے ملی۔ انہوں نے ہر دو گرام پوچھا۔ میں نے بتایا کہ آج سے پہلے کو اپ کے ملک کینیڈا پہنچ رہا ہوں لیکن اپ کے شہر ریگا نا سے بہت دوار، ٹور و نٹو اور دونوں شہروں میں تقریباً سترہ سو میل کا فاصلہ حاصل ہے۔ اس لیے ملاقات نہ ہو سکے گی۔

دیار غیر میں پرانے دوستوں کی آواز ٹیلی فون پر سن کر ڈری مسٹر ہوتی ہے۔ ہرنس لال نازنگ کی آواز سُن کے بھی خوشی ہوتی۔ کافی دیر ہم ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے بندستان اور بالخصوص دہلی میں اردو کی سرگرمیوں کے متعلق تفصیل سے پوچھا۔ ہرنس لال نازنگ یونیورسٹی اف ریگا نا میں آبجکسشن کے پروفیسروں میں۔

تحوڑی دیر بعد ڈاکٹر وصی اللہ خاں کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ڈھائی بجے آپ کے یہاں پہنچ رہا ہوں تاکہ آپ کو ایرپورٹ لے جاؤں۔ ڈاکٹر وصی اللہ خاں سے ملاقات ایک ڈرے عالم سے ملاقات ہے اس لیے اس اطلاع سے مسٹر ہوئی کہ آج تھوڑی دیر پھر آن کا ساتھ رہے گا۔

لیکن وصی اللہ خاں یونیورسٹی کی ایک میٹنگ میں ایسے معروف ہوئے کہ ڈھائی کے عرض ساڑھے تین بجے پہنچے۔ ایرپورٹ بہت دور تھا۔ چنانچہ جب ہم دہاں پہنچنے تو امریکن ایر لائنز

کی وہ فلاٹ تسلیم سے مجھے ٹور و ٹاؤ جانا تھا انخل چکی تھی۔ فلاٹ کا وقت چار بجے تھا اور ہم جب ایر پورٹ پہنچ تو ہمارا بج کے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ امریکن ایر لائنز کا ذریعہ پروجھ خاتون تھیں انہوں نے مشورہ دیا کہ پانچ بجے یونا سڈ ایر لائنز کی فلاٹ ٹور و ٹاؤ جا رہی ہے۔ آپ کو ممکن ہے اس میں جگہ مل جائے۔ نہ ملتے تو آپ کی نشست امریکن ایر لائنز کی سات بجے والی فلاٹ میں محفوظ کر دوں گی۔ چنانچہ ڈاکٹر وصی اللہ خاں اور میں یونا سڈ ایر لائنز کا ذریعہ پر پہنچے۔ دہائی پتا چلا کہ شاید کسی پورٹ کی غلطی سے اور بکنگ ہو گئی ہے اور یونا سڈ ایر لائنز والے کسی بھی Confirmed نشست والے ایسے مسافر کو ڈیزیریڈ سوڈ الزمکٹ کی قیمت کے علاوہ دینے کو تیار ہیں جو اپنا ملک و اپس کرنے پر رضامند ہو جائے۔ اب اس صورت حال کے پیش نظر میرے لیے Confirmed seat کی گنجائش باقی رہ گئی تھی۔ چنانچہ واپس امریکن ایر لائنز کی کامیابی اور سات بجے والی فلاٹ میں ریزرویشن کرالی۔ اس ریزرویشن کے بعد اطمینان ہو گیا لیکن یہ پریشانی رہی کہ ٹور و ٹاؤ کے احباب کو بار بار ایر پورٹ آنے کی زحمت کرنا ہو گی۔ اگرچہ انہیں دوبار ٹیلی فون کے ذریعے سے اطلاع دے دی گئی تھی لیکن میرے میزبان بیدار نہ تھے صاحب بہلی فلاٹ پر مجھے لیسنے کے لیے ایر پورٹ روانہ ہو چکے تھے۔

اس تاخیر کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وصی اللہ خاں صاحب کے ساتھ دو ایک گھنٹے اور سیر کرنے کا موقع مل گیا لیکن یہ خلش ضرور تھی کہ ٹور و ٹاؤ میں احباب کو زحمت ہو رہی ہو گی اور اب کہ ریزرویشن پختہ ہو گیا اور وصی اللہ خاں کے ساتھ پر تکلف چلے بھی پلی لی تو میں نے انہیں واپس تشریف لے جانے پر مجبور کیا کیونکہ ان کی مھرو فیض کا مجھے پورا احساس تھا۔ ڈاکٹر وصی اللہ خاں نے جاتے جاتے یہ احتیاط بھی کی کہ مجھے اس لاونج میں بٹھا گئے جس کے واحد دروازے (ویگٹ نمبر ۵) کا کارڈیور میرے طیارے کے اندر ہی پہنچتا تھا۔

آن کے جانے کے کوئی ڈیزیریڈ گھنٹے بعد طیارے کی رو انگلی کا اعلان ہوا اور میں نے ایک بھوم کے ساتھ جس میں پری دشون کی کمی نہیں تھی طیارے میں جا کے اپنی جگہ سنبھالی۔

طیارہ میری گھڑی کے مطابق ایک گھنٹہ وس منٹ بعد ۸ نج کرہ پیس منٹ پر ٹور و ٹاؤ پہنچ گیا لیکن پتا چلا کہ ٹور و ٹاؤ کا وقت ایک گھنٹہ آگے ہے اس لیے سوئیوں کو آگے کر کے میں نے اپنی گھڑی میں نوجھ کے پھیس کر دیے اور ایک گھنٹہ وس منٹ کا وقت چھوٹ موٹ دو گھنٹہ وس منٹ میں تبدیل ہو گیا۔

کلمبس کے دلیں میں

امیگریشن پر پائی منٹ سے زیادہ صرف نہ ہوئے اور کشمپر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ امیگریشن میں مجھ سے تین چار سوال کیے گئے۔ میرے جوابات کو تسلی بخش پاکر کافڑ پر بیٹھی ہوئی اڑک نے تھینک یو کہا اور کہا کہ آپ کو کشمپر میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ گرین چینل سے باہر جا سکتے ہیں۔

باہر آیا تو بیدار بخت صاحب میرے انتظار میں ایر پورٹ پر موجود تھے۔ وہ تین چار گھنٹے سے وہاں بیٹھھے تھے۔ ظاہر ہے کہ انھیں اس دوران میں کتنی کوفت ہوئی ہوئی۔ بیدار بخت صاحب سے تعارف ہوا تو پتا چلا کہ میرے عزیز دوست سکندر بخت صاحب کے بھتیجے ہیں۔ اس وقت ایک دل قربت کا احساس ہوا۔ وہ اپنے گھر لے آئے جو ایر پورٹ سے ہبھیس میل کے فاصلے پر ہے۔

گھر پہنچ کر اُن کی بیوی اپنیتا سے ملاقات ہوئی۔ بہت خوش خلق اور مہمان نواز بھی ہے۔ بیدار اور اپنیتا نے بتایا کہ اُن کے دونوں بچے ہیں۔ ناتاشا اور ساشا۔ ناتاشا نو⁹ برس کی ہے اور ساشا چار برس کا۔ ساشا نے آج ہی اسکول جانا شروع کیا ہے۔ اس وقت تک دونوں بچے سوچ کے تھے۔

میں ابھی بہنچا ہی تھا کہ افضل امام صاحب اور انور صاحب کے ٹیلی فون آئے دونوں دوست پاتنخ بھے ہی سے میرا انتظار کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ pleasant جس ٹیلی فون سے ہوا وہ میرے بھتیجے محظوظ مصطفیٰ کا ٹیلی فون تھا۔ نہ جانے surprise مجھے کیوں یہ خیال تھا کہ محظوظ مصطفیٰ انگلستان میں مقیم ہیں اور اب جو کینیڈا پہنچتے ہی اُن کا ٹیلی فون ملا تو جو مسرت ہوئی اس کا بیان لفظوں میں نہیں۔

محظوظ مصطفیٰ میرے عزیز دوست منظور مصطفیٰ کے فرزند ہیں اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ محظوظ کے بعد منظور صاحب خود ٹیلی فون پر آگئے۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ پتا چلا کہ ان کی بیکم سعیدہ بہن بھی ہیں ہیں۔ اُن سے بھی ٹیلی فون پر بات ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے میں حیدر آباد اور سری نگر کی یادوں میں گم ہو گیا۔ سری نگر جہاں منظور مصطفیٰ صاحب کے ساتھ دو تین برس کی مسلسل رفاقت رہی اور حیدر آباد جہاں رہا تھا۔ ہونے کے بعد منظور صاحب مقیم ہوئے۔ کھانے کے بعد بیدار بخت کی لا بے مری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مختلف موضوعات

پر کتابوں کی خاصی تعداد اور انہیں سلیقے سے رکھا ہوا دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اردو کی کتابیں ان کی لائبریری میں بڑی تعداد میں نظر آئیں۔ شوار کے دوادیں اور کلام کے مجموع فرنگ اصلیہ، معارف اسلامیہ لا چور کی اور انسائیکلو پیڈیا اور نقوش، ندن اور راق اور سیپ کے خاص نمبر سب ترتیب سے رکھے ہوئے نظر آئے۔ شوار کے مجموعوں میں مجھے اپنی کتاب "بیکراں" کا تیسرا ڈیشن بھی نظر آیا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ والد محترم کا مجموع غزلیات "شعلہ نوا" بھی موجود تھا۔ کینیڈا میں اردو کی یہ لائبریری دیکھ کے حیرت بھی ہوئی اور سرست بھی۔ کھانے کے بعد میں یہی کتابیں دیکھتا رہا اور جب سونے کے لیے بستر پر لیا تو نور و نٹو کے وقت کے مطابق ڈیڑھ نجی چکا تھا۔

(۲۳)

لیک ایثار یونک

صحیح سات بجے آنکھ کھل گئی۔ خیال آیا شکا گو میں تو بھی چھے ہی بجے ہوں گے۔ چنانچہ پھر سو گیا اور ساڑھے آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ اس وقت تک بیدار اپنے دفتر جا چکے تھے۔ ایتا بیٹی نے چاۓ بنادی۔ چاۓ کے بعد وہ نیچے basement ورزش کرنے چلی گئی کہ وہ ساڑھے نو نمک ٹیلی دیڑن پر ورزش کرنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ میں ڈائیٹ کر روم میں چاۓ بھی پیتا رہا اور ساشا کی شرار توں سے بھی محفوظ ہوتا رہا۔ حضرت نے دوچھے کارن فلیکس کھانے میں آدھ گھنٹہ لگا دیا۔ ان کے ساتھ ایک کتاب پر میرا جھگڑا ہو گیا۔ اس پر چھپا تھا This is my book. اب میں اس کے معنی یہ نکالتا تھا کہ یہ میری کتاب ہے اور ان حضرات کو خدا تھی کہ کتاب ہے ہی ان کی۔ آخر ان کے دلائل جس سے کو ان کی بات مانتا ہی پڑی۔

اتھے میں ایتا آگئی۔ ہم دونوں نے ناشرتہ کیا۔ سامنے ٹیلی دیڑن پر واکٹر گوپی چند نارنگ کا پروگرام آزما تھا۔ کرنل انور ان سے انٹر و پولے رہے تھے۔ موضوع

تمہارا دوسری سانیات اور اردو زبان و ادب۔ یہ پروگرام دیکھو ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بھی۔ یہ حفظ الکبیر قریشی کا ٹیلی فون تھا۔ اینتا کو انھوں نے بتایا کہ وہ گاڑی لے کر آ رہے ہیں اور مجھے سپر کرانے لے جائیں گے۔ قریشی صاحب واجدہ بسم کے بہنوں ہیں۔ کینیڈا میں اردو کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ علم و ادب، شاعری، اسلامیات اور عروض پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کا انگریزی ادب اور انگریزی شاعری کا مرطاب العہ بھی باعثِ رشک ہے۔ خدا اس اجمن کو ہمیشہ قائم رکھے جو حفظ الکبیر قریشی کرنل انور، بیدار بخت، اقبال، امیر صولت، رحیم اخیان اور افضل امام کی کوششوں سے یہاں کجی ہوئی ہے۔

تحوڑی دیر میں حافظ محمد اشتیاق صاحب تشریف لائے۔ آپ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طالب علم ہیں۔ اب پاکستانی ہیں۔ ٹرے پاک سے ملے اور بہت دیر تک باتیں رہیں۔

حافظ محمد اشتیاق رخصت ہوئے تو قریشی صاحب آگئے۔ وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اُن کے ایک دوست امیر صولت صاحب تشریف لائے اور ہم تینوں قریشی صاحب کی گاڑی میں بیدار بخت صاحب کے گھر سے روانہ ہوئے۔ جس علاقے میں بیدار بخت کا مکان ہے اُس کا نام آجمن کورٹ ہے اور جس طرح امریکہ میں میرا صدر مقام ڈاؤنرز گرو درہ اسی طرح کینیڈا میں اجمن کورٹ میرا صدر مقام ہے۔ میری امریکہ اور کینیڈا کی پہچان کی ابتدا اور انتہا ان ہی مقاموں سے ہوئی۔ میکن کیا پہچان کی ابتدا اور کیا انتہا؟ جیران ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔

سب سے پہلے ہم لوگ Searborough Centre میں پہنچے۔ یہ آجمن کورٹ کا میپل سنٹر ہے۔ یہاں ایک سیلیخہ سنٹر ہے جس کے کروں اور صفائی کو دیکھ کر شکا گو، ساسکو اور دو شنبہ کے ہسپتال یاد آگئے۔ کہیں گرد کے ایک ذرے کا نشان نہیں تھا۔ کار پوریشن کا کمرہ اجلاس دیکھا۔ اس پر فاؤنڈار ہو ٹل کا گمان ہوتا تھا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ مرتباً نظر آیا۔ یہاں سے ایک شاپنگ سنٹر میں پہنچے۔ یہ بھی یورپ، روس اور امریکہ کے شاپنگ سنٹروں کی طرح ایک عجائب خانہ تھا اور میرے لیے اس عجائب خانے کا لطف اس لیے زیادہ ہو گیا تھا کہ میں نے یہ سفر فارن ایکسچنج جیب میں رکھے بغیر شروع کیا تھا۔ چنانچہ شاپنگ سنٹروں

کے ہر بھوبے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالنے کے سوا اور کچھ میرے بس میں نہ تھا۔ قُرب و بعد کے اس کر شمئے نے اس سفر میں ایک خاص لذت کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ خود ساختہ حائل کوئی دیدار نہ ہے۔ جیسے۔

کینیڈا کا رقبہ بندستان سے تین گناز یاد ہے لیکن آبادی صرف دو کروڑ میں لاکھ ہے اس سے ہوا اور فضائی رطافت اور پاکیزگی کا بخوبی اندارہ کیا جاسکتا ہے۔

اس لطیف ہوا میں سانس لیتے ہوئے ہم لوگ صولت صاحب کے دولت کدے پڑتے پہنچے۔ وہاں ہم نے کھانا لکھایا۔ صولت صاحب اسکوں جا کر اپنی پنجی گل کوئے آئے اور یہاں سے ہم لوگ یک انشار یو کوروانہ ہوئے۔

یک انشار یو دنیا کی خوبصورت جھیلوں میں ایک جھیل ہے۔ قریشی صاحب نے اس کا رقبہ وغیرہ بنایا لیکن مجھے تو اس پر بھی سمندر کا گمان ہوا جیسے یک شیگن پر سمندر کا گمان ہوتا تھا۔

گھر سے چلتے تو ہمہ آبادی کے ایک حصے گزرے۔ ایک ریلوے بادر بھی قریب ہی تھا جس پر کھڑی ہوئی ایک مال گاڑی کے ڈبے جو گئے تو اسی نوٹے سے زیادہ نکلنے۔ یہ بھی عجیب ممالک ہیں۔ ڈر کوں کی لمبائی ہمارے یہاں کے ڈر کوں سے تین چار گناز یاد ہے۔ اونچائی دُگنی اور نگنی۔ بعض ڈرک تو ایسے دیکھھے جو بارہ بارہ چودہ چودہ موڑ کاروں کو اٹھائے یہے جا رہے تھے جسے کوئی دیو پر یوں کو اعناؤ کر کے بھگاتے یہے جا رہا ہو۔ اور ریل گاڑی دیکھی تو ہماری ریل گاڑیوں سے تین چار گناز یاد ہے طویل۔

اس آبادی سے نکلنے تو ہماری موڑ کار ایک پارک میں داخل ہوئی۔ اس کی فضنا کو دیکھ کر مجھے راوی نہیں کاٹو پی پارک یاد آگیا۔ اس پارک یا جنگل میں اسی ٹوپی پارک کی پیک تھی۔ سڑک بھی قریب قریب اسی طرح فراز سے نشیب میں اتر لی جا رہی تھی۔ آخر تھوڑی دری میں ہم اصل جھیل کے کنارے تھے جس کے خسن و جمال کے بیان کے لیے مجھے الفاظ نہ مل سکیں گے۔ امر پکھ میں یک شیگن کو جب بھی دیکھا اس کے کنارے انسانی نیم عریاں جسموں کا ایک سیلاپ نظر آتا تھا اور نگاہیں کس بھی جھیل کی طرف اور بھی اس عریاں بدھنی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرف کٹھ جاتی تھیں لیکن یہاں جھیل کے خسن سے نظروں کو ہٹانے والا اور کوئی منظر نہیں تھا۔ ایک تو شام کا وقت تھا اور دوسرا یہاں کینیڈا میں امریکہ کے مقابلے

میں خنکی بھی قدرے زیادہ تھی چنانچہ اس وقت جھیل تھی اور ہم چار تنفس، قریشی صولت نپی گل اور یہ سند بارہ۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چینی بجھ نظر آیا جو پنک اڑا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف سے ایک مرد اور ایک عورت آتے دکھائی دیے۔ اگر چہ شام ہو چلی تھی لیکن سورج کی روشنی ابھی بدستور تھی۔ اسی ٹرک پر جس سے ہم آئے تھے ایک کار جس کے ساتھ عقب میں ایک موڑ لائیخ والبستہ تھی آتی دکھائی دی۔ کار میں بیٹھے ہوئے مرد اور عورت نے کار تو ایک جگہ پارک کر دی اور موڑ لائیخ کو جھیل میں آتا رکر رہا۔ سے دور گہرے پانی میں لے گئے کام اور آرام کی اس مالک میں کتنی عمدہ تقسیم ہے۔ ادھر ہمارے مشرقی ممالک میں جہاں ٹری حد تک نہ کام کا سلیقہ ہے نہ آرام کا۔

جھیل کا پانی قدرے طوفانی تھا اور اس پاس کی فضنا انتہائی پُرسکون۔ جہاں ہم تھے وہاں دو دو تک سبزے کافرش نہ کھا تھا۔ اس زمردیں فرش اور جھیل کے درمیان پتھر رکھے ہوئے تھے جھنوں نے دونوں یہ ایک حدفاصل قائم کر رکھی تھی۔ ایک طرف picnic spot پکانے کے لیے چوڑھے بھی موجود تھے۔ بعض چوڑھے ابھی گرم تھے جس سے یہ پتا چلتا تھا کہ پکنک کے شو قین ابھی کھاپی کے بہاں سے گئے ہیں لیکن کیا مجال جوز میں پر کاغذیاروں کا ایک ٹکڑا یا پلاسٹک کا کوئی چھوٹا برتن یا سالن کا ایک ذرہ بھی موجود ہو۔ اس قسم کی تمام بھی کچھی چیزوں کوڑے کے ڈرموں میں ڈال دی گئی تھیں جو قریب ہی ہوتے تھے اور اور پر سے ڈھکے ہوتے تھے۔

والپس آئے تورات کو بیدار بخت کے گھر میں محفل جمی۔ کرنل انور حفظ الکبیر قریشی کرشن نارائن ہاکسر، امیر صولت، اقبال سب دوست موجود تھے۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران میں برادرم منظور مصطفیٰ اور ان کے فرزند مسعود تشریف لائے اور تمام دوستوں کی اجازت سے مجھے تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں سعیدہ بہن ہے ملاقات ہوئی ہانپی ہڑو بیگم مسعود سے بھی۔ بیٹی نسرین کو دیکھا تو میں پہچان ہی نہ سکا۔ یہ چھوٹی سی گزیا اب آئی ٹری ہو چکی تھی۔ میں ایک بار پھر گویا حیدر آباد واپس پہنچ گیا۔ عالشہ اور ارشاد کے گھر میں۔ یہ چند لمحے بھی زندگی میں کتنے غنیمت تھے! لیکن وقت کہاں ہر کتابے وقت تو ایک مسلسل رفتار کا نام ہے اور لمبے جو ایک بار گزر گیا، یادوں کے نہاد خانے

میں تو پہنچ جاتا ہے دوبارہ ہاتھ نہیں آتا۔

بہر طور پر کوئی ایک لگنٹے میں اس محفل میں واپس پہنچا۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ اپنی غیر حاضری کے لیے دوستوں سے مغدرت کی اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب یہ محفل ختم ہوئی تو رات خاصی جا چکی تھی۔

(۲۳)

ترے جلووں کے آگے طاقتِ شرح و بیان رکھ دی

آج صحیح حفظ الکبیر قریشی کا ٹیکی فون آیا کہ وہ مجھے یہ آرہے ہے میں لیکن تھوڑی دیر میں امیر صولت صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ قریشی صاحب گھر پر برادر انتظام کر رہے ہے ہیں۔ چنانچہ تم دونوں وہاں پہنچو۔ قریشی صاحب کی علمی باتیں جان محفل بن گئیں۔ آج کا پر ڈگر جو کل طے ہوا تھا یہ تھا کہ آج Niagra falls دیکھیں گے۔ لیکن آج بادل تھے خنکی بھی قدرے زیادہ تھی اس لیے تھوڑی دیر اس مسئلے پر گفتگو رہی کہ نیا گرا فائز کا دیدار کل پہلے توی کیا جائے لیکن کل کس نے دیکھا ہے۔ فیصلہ تھی ہوا کہ آج ہی اس منظر سے لطف اندوڑ ہونا چاہیے۔ ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ ہاکر صاحب تشریف لائے وہ میرے لیے ایک برساتی لائے تھے مخفض اس خیال سے کہ آج بادل ہیں اور اگر بارش آجائے تو نیا گرا فائز پر بارش سے محفوظ رہنے کا انتظام ٹھیلے ہی سے کر دیا جائے۔ ویسے بھی بعض دفعہ نیا گرا سے ایسی پھوہاراً لختی ہے کہ یہ منظر دیکھنے والے بھیگ جاتے ہیں۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شکاگو اور الہلائی شکاگو کے مینجنگ ڈائرکٹر لطیف اوسی صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے کریسٹ اور الہلائی کے بعض شمارے عنایت کیے۔ ان تمام شماروں میں ہندستان اور پاکستان کی ادبی خبریں موجود تھیں۔ ایک شمارے میں میرے حالیہ سفر پاکستان کا ذکر تھا۔ ایک میں حکومت پنجاب کی طرف سے مجھے دیے ہوئے ایوارڈ کی تفصیل درج تھی۔ اوسی صاحب سے کہنی دیا میں اردو کی نشر و اشاعت

کے متعلق دیر تک بات رہی۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ ہندستان اور پاکستان سے کتابیں اور جرائد خاصی تعداد میں منگوا ناچاہتے ہیں لیکن ابھی تک اس سلسلے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندستان واپس جا کر میں اس سلسلے میں باشtron سے بات کروں گا۔

قریشی صاحب نے شاہ حسین رزاقی کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ یہیں ٹورنوں میں مقیم ہیں لیکن ان کا گھر بہت دور ہے۔ انھوں نے ان کی کتاب

DisCourses of Iqbal

ذکر کیا۔ میں نے کہا ہیں نے اس کتاب کے بارے میں سنا ہے لیکن دیکھی نہیں ہے۔ غاباً جو کچھ اس کتاب میں ہو گا وہ بعض اور کتابوں اور رسائل میں بھی بکھرا ہوا مل جائے گا لیکن جب کتاب دیکھی تو میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ رزاقی صاحب نے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی محنت صرف کی ہے اور اقبال کے انگریزی نشر پارے مختلف عنوانات کے ساتھ اس میں یکجا کر دیے ہیں۔ اس کتاب کے چند ایک عنوانات یہ ہیں:

Political Treatises.

Presidential Addresses.

Islamic Studies.

Contribution to the New Era.

Philosophy of the Self

Islam and Qadianism

Miscellaneous.

میں اس کتاب کے بعض حصوں کو دیکھ رہا تھا کہ قریشی صاحب نے میرا انہا ک دیکھتے ہوئے فرمایا اس کتاب کی ایک جلد اور میرے پاس موجود ہے وہ میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ قریشی صاحب نے اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا جو میرے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ کی جیشیت رکھتا ہے۔

اب ایک نجع رہا تھا۔ ہم سب نے وہاں مل کے کھانا کھایا۔ کھانا ہندستانی تھا۔ بہت لذیذ۔ بعض دوستوں نے کھانے کی تعریف کی اور قریشی صاحب کو اس کی داد دی جو انھوں نے خوشی سے قبول کی۔ اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کھانا پکھانے میں محنت کوئی کرے اور واد کوئی وصول کرے۔ کھانا قریشی صاحب کی بیگم نے پکھایا تھا جو کچھ میں معروف ہونے کے

باعث ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو سکی تھیں اور قریشی صاحب نے دادموں و صول کی جیسے ہر چیز انہوں نے خود ہی پکھائی ہو۔

انتئے میں بیدار نخت تشریف لے آئے۔ اب ہماری منزل قدرت کا وہ مشاہدہ کا رتھا جسے دیکھنے کے لیے دور دور سے دنیا کے سیاح آتے ہیں اور جس کا نام ہے Niagra Falls missisauga missisauga نامی ایک شہر ہے۔

ان کا گھر نیا گرافائز کے راستے میں missisauga missisauga نامی ایک شہر ہے۔ تین لاکھ کی آبادی کا ایک شہر ہے۔ گویا جمتوں کے برابر لیکن جمتوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے اور کہیں زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔

کرنل انور گھر پر ہمارے منتظر تھے انہوں نے بعض ان اردو اخبارات کے شمارے عنایت کیے جو کینیڈا سے نکلتے ہیں مثلاً ایسٹرن نیوز، پاکیزہ، امروز، الہلال، ہنگامہ، اچل حال پاکستان، اواز، پیغامبر، اصداء مشرق وغیرہ۔

ایک روز قبل مولانا عبد الحمید سالماں کی کتاب سرگزشت "کاذک رأیا تھا۔ وہ میر پاس نہیں تھی۔ انہوں نے اس کی بھی ایک جلد عنایت کی اور یہ قافلہ نیا گرافائز کو روانہ ہوا۔

نیا گرافائز ٹورڈ ٹاؤن سے کوئی آئی میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم کوئی تیس میل پبل پکے تو پھر لیک انشا رو سامنے تھی لیکن اس کا یہ وہ حصہ نہیں تھا جو میں قریشی صاحب اور صولت صاحب کی سیت بس ایک روز پہلے رکیکہ چکا تھا۔ یہ اس کا ایک اور حصہ تھا جو کل والے حصے کی طرح سمندر ہی معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں اس کے ایک کنارے پر فولاد کے متعدد کارخانے تھے جن میں روزانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں ٹن فولاد پیدا ہو رہا تھا۔

اب ہماری گاڑی نیا گرا شہر میں داخل ہوئی۔ چھوٹا سا خوبصورت دھماکہ دھلا یا شہر اور گاڑی ذرا شہر کے باہر نکلی تو پانی کی ایک چادر ملندی سے پستی میں گرفت دکھائی دی۔ یہ نیا گرافائز کا وہ حصہ تھا جو امریکہ میں ہے۔ چند ہی قدم آگے بڑھے تو وہ ابشار نظر آیا جو کینیڈا میں ہے۔ ابشار کیا تھا جلال و جمال کا ایک ایسا امتزاج تھا جو اس سے قبل شاید ہی نظر وہی نظر وہی نظر نہ نہیں... دیکھا تھا۔ بے اختیار اصغر کا یہ شعر زبان پڑھ آیا۔

ترے جلووں کے آگے طاقتِ شرح و بیان رکھو دی
زبان بے نگہ رکھو دی نگاہ بے زبان رکھو دی

کشمیر میں اہر ابل کے آبشار کا بڑا شہر ہے لیکن میری محرومی کہ کشمیر میں ۹ برس میرا قیام رہا اور اب بھی میں جبوں و کشمیر میں ہوں لیکن اہر ابل آبشار بھی تک میں نے نہیں دیکھے اس لیے کہ نہیں سکتا کہ دونوں میں کیا فرق ہے۔ ویسے کشمیر کے بعض حصے حسن و جمال میں امریکہ کی نیڈا اور یورپ سے کہیں بڑھ کے ہیں لیکن اہر ابل کے آبشار نہ دیکھنے سے آج جو احساسِ محرومی ہوا اُس کا بیان ممکن نہیں۔

بہر ٹور نیا گرا کے آبشارِ یقیناً عجوہ روزگار ہیں۔ ایک لمبا جوڑا دریا جس کی چورائی بھی خاصی ہے انتہائی وقار اور ممتازت کے ساتھ بہتا ہوا ایک ایسے مقام پر ہمچلتا ہے جہاں پھر دوں کی ایک چنان گھوڑے کے سُم کی شکل بناتی ہوئی بہت نیچے تک چلی گئی ہے۔ دہاں آکے یہ دریا اپنی پوری چورائی کو پانی کی ایک دیز چادر میں تبدیل کر کے اس طرح نیچے گرتا ہے کہ انسان بیا جتا اور یا قہار کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں پانی کی ہلکی ہلکی بوندھ دھندر کی صورت اختیار کر کے سارے منظر کے حُسن کو دو بالا کر دیتی ہے اور نگاہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ دریا کے بہاؤ کو دیکھے یا اس کے آبشار بناتے ہوئے نظارے کو یا بوندھوں سے تغیر شدہ دھندر کے جہاں کو یا نیچے نہماں نہیں مارتے ہوئے پانی کو جو پھر دریا بن کے بتا جا رہا ہے۔ فلانگ ڈیڑھ فلانگ پر امریکہ کا ساحل ہے اور وہاں بھی اس دریا دریائے نیا گرا کی ایک اور شاخ بھی منفرد کھار بی ہے۔

اس وقت جب کہ میں یہ چند سطحیں لکھ رہا ہوں میرے لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس منظر کے حُسن نے مجھ پر زیادہ اثر کیا یا اس کی ہیبت نے یا کسی ایسی کیفیت نے جو حُسن اور ہیبت دونوں کے امتزاج سے پیدا ہو رہی ہے۔

یہاں کرنل انور اور بیدار نے چند تصاویر میں اور پھر ہم چاہے چینے کے لیے ایک ریٹرو نٹ میں گئے جو وہیں دریا کے کنارے واقع ہے۔ دہاں بھی خوش قسمتی سے ہمیں ایسی جگہ بیٹھنے کو ملی کہ نیا گرا کے آبشار ہماری نظاوں کے سامنے تھے۔ ورنہ شناہ ہے یہاں اکثر ایسی بھیڑ ہوتی ہے کہ اس طرح کی جگہ بیٹھنے کو نہیں ملتی۔ ان مناظر نے کھانے چینے کو اور منے دار بنایا۔

اتنے میں سامنے امریکی ساحل کے آبشار کے نشیب میں قوس قزح بنی شروع ہوئی جو ڈھنتے
 ڈھنتے اور پر تک چلی گئی۔ اب مجھے پتا چلا کہ اس پل کو
 Rain-bow-bridge
 کے قریب امریکی علاقے میں ایک خوبصورت
 Rain-bow-bridge
 پلیٹ فارم بنایا ہوا تھا جہاں سے اہل امریکہ کینیڈ اوائل آبشار کا نظارہ کرتے ہیں۔ میرے جی
 میں آئی کہ ہم یعنی Rain-bow-bridge
 پہنچیں لیکن میں اپنا پا سپورٹ اور ویز اگر بھول آیا تھا اس لیے اس چند گز کے فاصلے کو
 عبور کرنا میں الاقوامی قانون کی رو سے ناممکن ہو گیا۔

جب ہم لوگ یہاں سے چلتے تو نکا ہیں بار بار اس منظر کی طرف ٹھٹھی تھیں اور وہی
 کیفیت تھی جو کوچہ محبوب سے چلتے وقت ہوتی ہے۔ راستے میں کرنل انور احمد اپنے گھر اتر گئے
 اور میں بیدار صاحب کے ساتھ اُن کے مکان پر ہبھا

(۲۵۱)

کرنل انور احمد

آج کے دن کا مشتری حصہ گھری پر گزرنا۔ کچھ وقت میں نے لکھنے میں گزارا اور کچھ وقت
 بیدار نخت کی لا بُربری دیکھنے میں۔ بعض کتابوں پر ایک نظر ڈالی۔

آج رات کو دعوت کرنل انور احمد کے دولت کدرے پر تھی کرشن ہاکر صاحب جب
 وعدہ بائیک بجے تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ کرنل صاحب کے مکان پر لے گئے۔ خاصی
 تعداد میں احباب ہمہ سے وہاں موجود تھے۔ تھوڑی دیر میں ایتا اور بیدار بھی وہاں پہنچ
 گئے۔ اس محفل میں جناب شاہد حسین رزا قی، ڈاکٹر جمال نقوی، جناب انور چودھری، جناب
 ہارون صدیقی، جناب حفظہ المکبر قریشی، کرشن نارائن ہاکر اور اقبال خاں بھی تشریف فرمایا
 تھے۔ بہت رات گئے سنک محفل جمی رہی۔ چلتے وقت کرنل انور احمد نے چند اور اردو اخبارات
 مرمت کیے جو کینیڈ اسے نکلتے ہیں۔

کو لمبیں کے دلیں میں

کرنل انور احمد کا تعلق بھیرہ (پاکستان) سے ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اول اول جس مشاعرے میں شرکت کی وہ بھیرے ہی میں منعقد ہوا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ تین دن قبل جب میں ٹور و ٹاؤ پہنچا اور بیدار صاحب کے دولت کردے پر مقیم ہوا تو سب سے پہلا ٹیلی فون مجھے انور صاحب ہی کی طرف سے ملا۔ انہوں نے اپنا تعارف کرتے ہوئے دوبارہ بھیرے کے مشاعرے کا ذکر کیا۔ اس مشاعرے کی روداں انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنتی اور کتابوں میں پڑھی کیونکہ ۱۹۲۰ء میں کرنل صاحب بہت چھوٹے ہوں گے یا شاید ابھی بیدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ میری عمر اس وقت آٹھ یا نو سال کی تھی اور میں نے اس مشاعرے میں والد محترم کا کلام سنایا تھا جو میں گھر سے زبانی یاد کر کے لے گیا تھا۔

کرنل صاحب نے اس سفر میں دو کتابیں عنایت کیں۔ ایک "تاریخ بھیرہ"، ابونا ہم فاروقی، اور دوسری کا ذکر میں پہلے کرپکا ہوں۔ سرگزشت عبدالجعید سالک، ثانی الذکر کتاب ایک زمانہ ہوا۔ میری نظر سے گزری تھی اور اب میرے پاس نہیں تھی۔ اب جو یہ کتاب کرنل انور احمد نے عنایت کی تو گویا ایک متابع گم شد دیبرے ساتھ اگئی۔

کرنل انور احمد اردو سوسائٹی اف کینڈا کے اہم ستونوں میں میں اور حفظۃ الکبیر قریشی، بیدار بخت، رحیم انجیان، افضل امام، اقبال احمد اور دوسرے پرستار انان اردو ہیں اور اس کی خدمت میں معروف رہتے ہیں۔

(۳۶)

ٹور و ٹاؤ میں مشاعرہ

میرا

Ontario Institute of Studies in Education

اج دن میں

لکھر تھا اور رات کو اسی انسٹی ٹیوٹ کے ایک ہال میں مشاعرہ۔ کوئی دو بجے کا وقت ہو گا میں اپنے لکھر پر ایک نظر ڈال رہا تھا کہ حفظۃ الکبیر قریشی صاحب اور اویسی صاحب (میں بنک ڈائریکٹر کریسٹ) اور الہلال (ٹور و ٹاؤ) تشریف لائے۔ اج دن میں میر کا پروگرام آن کے ساتھ تھا

چنانچہ ہم تینوں لگھر سے نکلے اور اس علاقے کی طرف پڑے جو بندستانی علاقہ کہلاتا ہے۔ بندستانی سے مراد یہاں بندستانی اور پاکستانی ہے۔ یہ علاقہ برصغیر بند و پاک کے لوگوں سے آباد ہے اور یہاں ساریاں، پان، اردو اور بندی کتابیں بکٹریت فروخت ہوتی ہیں۔ دکان رار بھی زیاد تر بندستانی اور پاکستانی ہیں۔ اس علاقے کا نام ہے

Gerrard Street

اس علاقے میں دکانوں کے نام اس طرح سے ہیں: ایتا بھوٹا پنگ سنٹر، شاپنگ سنٹر، نیشنل ریسٹورنٹ، کوہ نور فوٹو اسٹورز، پاپا جیت، انڈین ریکارڈ شاپ، چائے بیٹ، تاج محل سویٹ سنٹر، کیسری ریسٹورنٹ، موئی محل، کمال چائے ہاؤس (اس دکان پر قلمبھی اور خالوں کا بورد بھی آدمیوں کے لئے ملنا مشکل ہے) ایڈ پان، سونو ساری ہیلیس، او برے، تاج محل آڈیو سنٹر وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ایک بندستانی سینما لگھر بھی ہے۔ اس کا نام ہے ناز تھیٹر، اس میں فلم جو الائچی چل رہی تھی۔

یہاں ٹور ٹو میں اس قسم کے تین علاقوں ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والے زیادہ تر پوکنڈا (جنوبی افریقہ) سے آئے ہیں۔ جہاں تک بندستانی دکانوں کا تعلق ہے یہاں منفاسی ارٹسٹ بھی پیدا ہو کرے ہیں اور ان دونوں یہاں راجن اور بنیا کا بڑا چرچا ہے۔ کھانا ہم نے منزل ریسٹورنٹ میں کھایا۔ اس کے مالک بخاری صاحب لاہور سے آئے ہیں اور شروع و ادب سے خاصی رنجپی رکھتے ہیں۔ اس کام میں ان کے جھائی اسلام صاحب ان کے شریک کہا رہیں۔

اویسی صاحب کا الہمالی گیارہ برس سے باقاعدہ شناع ہو رہا ہے۔ کریمٹ (انگریزی پبلی اسی کا ایک حصہ تھا۔ اب دو برس سے ایک انگ اخبار کے طور پر جپپ رہا ہے۔) بندستانی علاقے کی پیر سے فارغ ہو کر ہم لوگ مالک رام صاحب کی بیٹی اور داماد اردون اور دکل صاحب سے ملنے کے لیے گئے۔ دکل ٹور ٹو سے باہر تھے۔ اردون اور زپھوں سے ملے۔ مالک رام صاحب کے فرزند سلمان بھی یہیں ہیں۔ وہ بھی لگھر پر موجود تھے۔ سلمان سے ملاقات میں برس بعد ہو رہی تھی۔ میں سال قبل جب میں بھیم میں مالک رام صاحب کے یہاں تھا تو سلمان نے مجھے اپنی گاڑی میں بھیم کی خاصی سیر کرائی تھی۔

وہاں سے ہم اویسی صاحب کے دفتر میں آئے۔ ان کی کتابوں کا ذخیرہ دیکھا۔ بہت عمدہ اور نادر کتابیں اس میں موجود تھیں۔ انہوں نے تھا لفظ بھی عنایت کیجئے جن میں کتابوں

کے تھائے بھی تھے۔ وہاں انہوں نے میرے سفر ٹور ڈنٹو کے تاثرات ریکارڈ کیے۔

اویسی صاحب کے دفترِ الہمال اور کریستن سے واپسی پر ایک دریافت ایسا۔

چھوٹا سا۔ اس کا نام ہے ڈان اور مجھے روس کا دریا ڈان یاد آگیا۔ اس دریانے تو ادب کی تخلیق کی ہے۔ اس چھوٹے سے دریانے اپنے اس پاس شادابیوں کی ایک چھوٹی سی دنیا آباد کر رکھی ہے جو سربراہ اویوس سے لبرند ہے۔

گھروپس پہنچ تو چھئے نجھکے تھے۔ سات بجے پیکھ کے لیے انتاریو انسٹی ٹیوٹ اوف اسٹڈیز ان ایجوکیشن میں پہنچنا تھا اس لیے فوراً ہاتھ منہ دھویا کپڑے تبدیل کیے اور اینتا اور بیدار کے ہمراہ انسٹی ٹیوٹ کو روانہ ہو گیا۔ عنوان تھا "اقبال کے فکری سرچشمے"۔ مال بھرا ہوا تھا لیکھ رہا تا میں منت تک رہا۔ اس کے بعد کوئی آدھ گھنٹے تک سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا۔ نوبجے مشاعرہ شروع ہوا، جس میں راقم التحریر کے علاوہ بیدار محنت، افضل امام، نزہت، نور شیخ، کرشن باکسر اور ضدا اور شرعا شریک ہوئے۔ یہ مشاعرہ رات کے گیارہ بجے تک رہا۔ مشاعرے کے بعد انور چودھری صاحب کے دولت کدے پر گپ شب کی محفل جسی اور ہم لوگ کوئی ایک بجے گئے تھے۔

تیرا یاب

(۲۷)

واپس امریکہ میں

آج مجھے نورِ نئو سے شکاؤ و اپس آنا تھا۔ نورِ نئو میں قیام مقاومتاً بہت مختصر رہا لیکن یہ مختصر قیام بہت بھروسہ اور تھا۔ دوستوں سے ملاقات بھی ہو گئی۔ اچھی مخفایں بھی منعقد ہو گئیں۔ اجمن اردو کینیڈ کے کاموں کی بھی ایک خوبصورت تصویر دیکھوں جس کے باعث ہلنة وقت دل مسلمان بھی تھا اور مسرور بھی۔

صحیح کو سازھے آٹھ بجے میں اور بیدار تیار ہو گئے اس وقت تک انہیں اور جیتنی نتاشا بھی جاگ گئیں۔ اگرچہ آج اوار تھا اور اوار کو ہساں لوگ دیر تک سوتے ہیں۔

بیدار اور میں کوئی سائیھے نہ بجے تک ایر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں تھوڑی دیر میں کرنل انور احمد بھی تشریف نے آئے۔ کافی دیر تک اپس میں گپ شپ رہی۔ اس کے بعد ملنگ اور کشمکش کی منزل آئی اور میں یہ منزل میں طے کر کے کرنل انور احمد اور بیدار صاحب سے مُرخصت ہوا۔ ان دونوں دوستوں کے خلوص اور محبت نے دل پر بہت اثر کیا۔ بیدار نخت، انور احمد، حفظ الکبر قریشی، لطیف اوسی، امیر صولت اور دوسرے احباب نے مجھے دو دن میں اپنا بتا تھا۔

ابھی میں لا فوج میں بیٹھا ہوا طیارے کی رو انگلی کے اعلان کا انتظار کر رہا تھا اور امریکن

ایر لائنز کی طرف سے ایک عجیب و غریب اعلان ہوا اور وہ یہ تھا کہ ہم لوگوں نے غلطی سے طیارے میں over-booking کر لی ہے۔ اب جو مسافر اپنی لینگ سڑک پر کے چار بجے تک ملتے ہوں انھیں ہم چار بجے کے طیارے سے امریکہ بھیج دیں گے اور ساتھ ہیں ایک سوڈا ریجنی اپنی طرف سے دیں گے۔ غاباً اس اعلان کا خاطر خواہ تباہ نہیں نکلا اور پانچ منٹ کے اندر اندر دوسرا اعلان ہوا کہ چار بجے سڑک پر کے ہم لوگوں نے دلتوی کرنے والے مسافروں کو کپنی کی طرف سے دو سوڈا ردیے جائیں گے۔ میں اس سفر میں قریب خانی جیب ہی تھا۔ جی میں تو میرے آئی کہ میں اپنی رو انگلی چار بجے تک ملتوی کر دوں اور امریکن ایر لائنز سے دو سوڈا رے لوں لیکن پھر خیال آیا کہ شکا گوا ایر پورٹ پر ڈاکٹر خورشید ملک یا ڈاکٹر ابو حصی اللہ خاں یا ڈاکٹر عبداللہ غازی مجھے یعنی کے بیے آئیں گے۔ انھیں نہ مت ہو گی کیونکہ پانچ بجے پھر مجھے ایر پورٹ سے روانے کا مسئلہ ان کے سامنے ہو گا۔ اس لیے میں نے دو سوڈا رکی طرف با تھوڑا بڑھایا۔ لیکن ایر لائنز کا اعلان بے کار نہیں گیا۔ اکثر زکر کے لیکنوں نے اس اعلان سے فائدہ اٹھایا اور جب ہم لوگ طیارے میں جا کر نیچے تو دیکھا چند نشستیں خانی پڑی ہیں۔ یہ اس اعلان کا تباہ تھا۔

جهانزش کا گوبہ نہیں۔ اس وقت بیری گھری تی گیارہ نجع کے پھاس منٹ ہوئے تھے۔ گھری کو ایک گھنٹہ پیچھے کیا اور وقت دس نجع کے پیچا س منٹ ہو گیا۔ ابھی میں سامان لے ہی رہا تھا کہ پر و فیر عبداللہ غازی نظر آئے۔ بڑی محبت سے ملے۔ ان کے ساتھ میں ان کے گھر ہنپنا۔ وہاں ان کے گھر کے لوگوں اور دوسرے اعزاز سے ملاقات ہوئی۔ خدا کے فہنیل و کرم سے ب علم و ادب کے گردیدہ نظر آئے۔ غازی صاحب نے ٹیکی فون کر کے عزیز محترم افتخار نسیم کو وہیں بلوایا۔ وہاں ہم نے کھانا کھایا۔ گپ شپ رہی اور کوئی تین بجے کے قریب افتخار مجھے لے کے اپنے گھر کئے۔ وہاں آرام کیا۔ رات کو کھانا کھایا اور ہم دونوں پر و فیر عبدالوحید فخری کے دولت کرے کو روانہ ہوئے جہاں پہلے سے طشدہ پر دراوم کے مطابق ایک شری نشست منعقد ہونا تھی۔

یہ ایک بہت بڑی شری نشست تھی۔ ہم انوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ شرود سخن کے پہلے دور کے بعد اکمل دشرب کا دور چلا۔ اس وقٹے میں فردوسی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے جو اسی شہر Tinley Park.

کیے۔ وہ تصویر یہ بھی دیں جو چند روز قبل سید صبر عفری، قتبیل شفافی، افتخار نیم اور خود فردوسی صاحب کے ساتھ گھپنگی کی تھیں۔ واپس فری صاحب کے مکان پر ہجئے تو نشست کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا۔ اور یہ دو کوئی رات کے بارہ بجے ختم ہوا۔

پروفیسر اسد حسین آج صبح ہی جنوبی افریقہ کے سفر سے واپس آئے تھے۔ ان کی واپسی کی اطلاع مجھے ڈاکٹر خورشید ملک نے ٹیلی فون پر نور و نتوہی دے دی تھی۔ اس اطلاع سے بُخھے سرت ہوئی کیونکہ دراصل پروفیسر اسد حسین کو جنوبی افریقہ کی متعدد ملوک و رئیسین میں پیکھر دینا تھے اور وہ محض میری وجہ سے اپنے پروگرام کو مختصر کر کے امریکہ واپس آگئے تھے۔ روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے یہ کہا تھا کہ اتوار ۳۱ ستمبر کو وہ واپس آجائیں گے اور انگلے دن یعنی پیر کو ان کی یونیورسٹی میں پیکھر ہو گا۔ انھیں یہ وعدہ یاد تھا چنانچہ انہوں نے آتے ہی مجھے پیکھر کا موضوع دیا اور یونیورسٹی میں اس کا اعلان کر دیا لیکن پیکھر کی تاریخ تم اس ستمبر کے عوض ۱۴ ستمبر کو دی کیونکہ مجھے پیکھر لکھنے کے لیے دون دن درکار تھے۔ پیکھر کا موضوع تھا "Indian Literature" اور طلبہ ہوں گے۔

فری صاحب کے دولت کوئے کی نشست کے بعد اسد حسین مجھے اپنے گھر لے آئے اور دو دن میں نے ان کے ساتھ بُبر کیے۔

(۲۸)

پاکستان سے ہندستان تک

۵ ستمبر کو ایسٹ ولیٹ یونیورسٹی میں جو مشاعرہ ہوا تھا وہ I B M Wabash Television نے رویکارڈ کیا۔ اس کے اپنے اخراج عنیز ارجمند صاحب نے یہ مشاعرہ

ریکارڈ کرنے کے بعد اسی روز بھروسے فرمائش کی تھی کہ میں کسی دن ان کے نیلی ویژن کو انٹر دیو دل مانحوں نے کہا تھا کہ یہ انٹر دیو میری ہی نظم و نثر کے بارے میں ہو گا اور یہ کم از کم دو گھنٹے کا ہونا چاہیے تاکہ امر مکمل کی یونیورسٹیوں میں دکھایا جاسکے۔ میں نے ان کی دعوت پشتکریہ قبول کر لی اور کہا کہ کینیڈا سے میری واپسی پر ہم اسٹمبر کو وہ اس انٹر دیو کا انتظام کر میں۔ مانحوں نے یہ بھی بتایا کہ پروفیسر عابد اللہ غازی اور افتخار نیم میرے انٹر دیو رہوں گے۔

چنانچہ آج صبح دس بجے کے قریب پروفیسر عابد اللہ غازی، افتخار نیم اور عزیز الرحمن صاحب پروفیسر اسد حسین کے دوست کدرے پر تشریف لائے اور میں ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ رستے میں تھوڑی بہت سیر بھی ہو گئی۔ گھر سے نکلنے ہی کا علاقہ آیا۔

اسے امریکہ میں اہل ہندو پاکستان دیوان ریونیو کہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نور و نشوکی کی طرح یہ علاقہ بھی اہل مشرق بالخصوص اہل ہندو اہل پاکستان سے آباد ہے۔ غائبائیہ بتانا میں بھول گیا کہ کینیڈا کے ہندستانی اور پاکستانی Gerrard Street کو جرہ اور اسٹریٹ کہتے ہیں۔

ہاں تو میں اندر کا نیں نور و نشوکی Gerrard Street Devon Avenue کی طرح ہیں یعنی ان کے نام ہیں اسٹینڈ ڈانڈین ریشورنٹ، پیٹیل بر اور ز، انڈریا ایکٹر انکس تاج ساری پیلس، او ما ساری پیلس، سنکم ریشورنٹ، شکار ریشورنٹ، حلال میٹ شاپ، ذی محیث میٹ شاپ، اور پیٹل فود و گیرز۔

جہاں میلی ویژن پر انٹر دیو ریکارڈ ہونا تھا وہ جگہ اسد حسین کے گھر سے پنٹیس میل کی دوری پر تھی۔ اسد حسین ننکن وڈ میں رہتے ہیں اور ریکارڈ نگ ایمجن میں تھی۔ یہ تمام شہر شکا گو کے مضافات میں ہیں اور چونکہ سیکڑوں میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اس لیے بعض وہ سکانس کی سرحد کے قریب ہیں، بعض انڈیا ناکی سرحد کے قریب اور بعض مشیگن کی سرحد کے قریب۔ ایمجن وہ سکانس کی سرحد کے قریب ہیں۔

انٹر دیو ایک نہیں دو تھے۔ ایک میری شرعی تخلیقات کے بارے میں اور دوسری تخلیقات کے بارے میں۔ دونوں دو دو گھنٹے کے تھے اور انٹر دیو یعنی والوں میں پروفیسر عابد اللہ غازی اور افتخار نیم کے علاوہ احمد رضا خاں بھی تھے جن کے دوست کدرے پر یہ انٹر دیو پیا گیا۔ عزیز الرحمن خاں کی سیگم عشرت نشااط بھی تھیں۔

دونوں انٹرو یو چونکہ میرے شر اور میری نشر کے تخلیقی سفر کے اردو گرد گھومتے رہے اس لیے عیسیٰ خیل سے شروع ہو کر راولپنڈی اور لاہور سے ہوتے ہوئے دہلی تک پہنچے۔ اور میں نے اس بھار پانچ لھنڑ کی بات چیت۔ میں کتنی ہی بار پاکستان سے ہندستان اور ہندستان سے پاکستان کا سفر کیا۔ نہ جانے کتنی ملاقاتیں یادوں کے افق پر بار بار اُبھریں۔ کتنے چہرے تھے جو اپنی چمک دکھائے رہے تو کتنے۔ کتنی مخفیں تھیں جو ماضی کے دھنڈکوں سے اُبھر کر میری نظروں کے سامنے آئیں اور یادوں کے نہایخانے سے نکل کر مجھے اتنے ساتھ بہا کر لے جاتی رہیں۔

کہاں ہو کارواں والوں کہاں ہو
تلائش کارواں ہے اور میں ہوں

احمد رضا خاں صاحب کا مکان ایک نہایت ہی پُر فضام مقام پر واقع ہے۔ مکان کے عقب میں ایک خوبصورت جھیل ہے جو اس جھیل کے کنارے پر رہنے والوں کی ملکیت ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی خوبصورت مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ قریب سمندر کی مکھیوں نے ایک چھتنا بنار کھا تھا۔ سورج مکھی کا ایک بچوں دیکھا جس کا قطر انہارہ انج نکھا۔

کھانا ہم لوگوں نے عزیز الرحمن صاحب کے دولت کرے پر کھایا۔ ان کے مکان کا لمبا پوڑا لان دیکھ کر ہندستان کے مکان یاد آگئے۔ وہاں سے چلتے تو گاؤں میں مکی کے کھیتوں سے گزری۔ امریکہ اگر میں نے باغات، پارک اور جنگل تو دیکھنے تھے لیکن کچھت اُج پہلی بار دیکھے۔ ایسے امریکی گاؤں کی فضادیت کھنے کا موقع اس وقت تک نہیں ملا تھا جس میں کچھت بھی ہوں۔ عزیز الرحمن صاحب نے بتایا کہ دودھ کی ایک ایسی ڈیری یہاں سے بہت قریب ہے جہاں گواٹے تازہ دودھ دوہ کے خریداروں کو دیتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اکثر ترکاری، آلو، ٹماٹر وغیرہ شاپنگ سٹرول سے نہیں بلکہ ان ہی کھیتوں سے خرید کے جاتے ہیں جو بازار کے مقابلے میں انتہائی ارزال ہوتے ہیں۔ امریکہ ایسے ملک میں یہ سب اطلاع میرے نیے بڑی جیرت کا باعث تھی۔

انٹرو یو شام کو ساڑھے سات بجے کے قریب ختم ہوئے۔ اب عزیز الرحمن صاحب کے سامنے پھر سو ڈیڑھ سو میل کا سفر تھا۔ چہلے انہوں نے افتخاری سیم کو گھر پہنچایا۔ پھر مجھے

کو لمبیں کے دلیں میں

اور پھر پروفیسر عابد اللہ نمازی کو گھر پہنچانے والیس الیجن پہنچے۔

جب میں گھر پہنچا تو دس بجے تھے۔ اسدین ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں آتے تھے۔ ان کے ڈپارٹمنٹ میں درس و تدریس صبح کو بھی ہوتی ہے اور شام کو بھی۔ اور ویسے بھی امریکہ میں محنتی پروفیسر اپنا زیادہ تر وقت یونیورسٹی ہی میں گزراتے ہیں۔ اپنے شبے میں اور یونیورسٹی کی لاپتہ ہوئی میں۔

واپس آکے جب میں لکھانا کھاچ کا تو پروفیسر اسد حسین کے بھتیجے اعماز صاحب بخوبی شکا گو شہر کی روشنیاں دکھانے لے چلے۔ انہوں نے پلیٹی میٹریم کے قریب یک مشین کے کنارے گاڑی روکی کیونکہ ڈاؤن ٹاؤن بقدر نور بنا ہوا اسی مقام سے نظر آتا۔

گاڑی سے ہم باہر نکلے تو سرد اور تیز ہوانے ہمارا استقبال کیا۔ تیز ہو کے باعث تبیل کے پانی میں لہریں اٹھ رہی تھیں اور ان لہروں میں چاند کی کرنیں محور قص خیس۔ دوسرا جانب سیزرا نا اور در دری فلک بوس عمارتیں جگ مگ جگ مگ اُر بھی تھیں۔ بجانب ہم دونوں یہ نظارہ کتنا دیکھتے ریکن ہوا کی تیزی اور سردي نے جسم میں کچھ پیدا کر دی تیرے دانت بخندنے لگا اور گاڑی کے اندر پناہ لئنے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اب پتا چلا کہ شکا گو کو Windy City کیوں کہتے ہیں۔

تیز اور سرد ہوانے باہمیں کی یاد دلادی کیونکہ اس قدر مرد اور تیز ہو اسے باہمیں کے علاوہ اور کہیں سابقہ نہیں پڑا تھا۔ انگلستان، بلجیم، ڈنمارک اور روس ویسے سرد مہارک میں بھی بلکہ اس طرح کی ہوا کا تجربہ کیا ہے۔ بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ باہمیں کے مقابلے کے ہوا تھی جو ہر یوں میں اتراتی چلی جا رہی تھی۔

اعماز نے روشنیوں کے اس شہر کی جو نیکر کرائی وہ اپنا جواب آپ تھی۔ گھر واپس پہنچنے تو اعماز فر امریکہ کی صفت اور نیکناوجی کے بارے میں بعض اہم اور دلچسپ بائیں بتا کر میرے علم میں اضافہ کیا۔ اس کے بعد میں تھوڑی دیر تک بکھتا پڑھتا رہا اور جب بستر پر یہاں تو صبح کے دونوں چلکے تھے۔

(۲۹)

شکا گو یونی ورستی لا بَریری

آج کادن احمد خاں کے ساتھ بسرا ہوا۔ وہ گیارہ بجے کے قریب اسد حسین صاحب کے پہاں تشریف لائے۔ پر دگرام یہ تمہار کہ دسکانسِن کی ریاست میں ایک جنوب والی سیر کی جائے گی لیکن اسد حسین نے یہ منورہ دیا کہ بیس واپس روانگی سے قبل شکا گو یونی ورستی کی لا بَریری با شخصوص ساؤ تھے ایشیں شعبے کی لا بَریری بھی ضرور دیکھوں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ساؤ تھے ایشیں لا بَریری کی لا بَریری میں مس ماریں پٹریسن کو ٹیکی فون کیا اور میں احمد خاں کے ساتھ شکا گو یونی ورستی کو روایہ ہو گیا۔

شکا گو یونی ورستی ایک بہت بڑی عمارت میں ہے۔ اس کا کمپس دور دوڑ تک پہنچیلا ہوا ہے اور اس کی لا بَریری بھی اسی تناسب سے کئی لمبی چوڑی منزلہ بھرے ہوئے ہے۔ میرے سامنے اس وقت صرف ساؤ تھے ایشیا لا بَریری تھی جس میں کتابوں کی تعداد ڈریڑھ لاکھ ہے۔ یہ کتابیں انگریزی سعیت پاپنگ زبانوں میں ہیں۔ زیادہ تر کتابیں ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال سے حاصل کی گئی ہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے کتابیں حاصل کرنے کے لیے امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا کے ناشرین کے دروازے بھی کھلکھلانے جاتے ہیں۔ بعض اور یونی ورستیوں کے اساتذہ سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ اس یونی ورستی کا ساؤ تھے ایشیا کے موضوع پر کتابوں کا ذخیرہ دنیا بھر کے بہترین ذخائر کتب میں شمار ہوتا ہے۔

مس پٹریسن اردو اور ہندی بہت اچھی جانتی ہیں اور جہاں تک جنوبی ایشیا کا تعلق ہے اُن کی واقفیت اس خطہ زمین کے اکثر علوم کے متعلق بہت حیران کن ہے۔ انہوں نے بُنی لا بَریری کے متعلق تفصیل سے بات کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ امریکہ کی بائیس یونی ورستیوں میں

اردو مختلف سطحوں پر پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کے علاوہ ہندستان کی زبانیں امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں وہ ہیں آسامی، بنگالی، بھارتی، ہندی، کشمیری، کونکنی، ملیالم، سنسکرت، منی پوری، مرٹھی، میواری، اڑیہ، پالی، پنجابی، سندھی، تمل او زندگو۔ پاکستان کی زبانوں میں اردو اور پنجابی کے علاوہ بلوجہ، سندھی اور پشتونہوا شامل نصاب ہیں۔ انگریزی عربی، منگولی، نیپالی، تبتی، پرنسپلیزی، پراکرت، فرانسیسی اور فارسی مذکورہ زبانوں کے علاوہ یہیں جو امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

لابریری کے مختلف گوشوں میں ریسرچ اسکالر مطالعے میں معروف نظر آئے۔ مس پیرسن نے مسٹر فلپ لٹ گن ڈورف سے تعارف کرایا۔ لٹ گن ڈورف نے اردو میں بات کی پتا چلا اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر انھیں عبور ہے۔ یہ تمسی داس پر کام کر رہے تھے۔

ایک گوشے میں اردو کتابوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ معلوم ہوا یہ
discarded کتاب ہیں۔ میں نے چند ایک کتابیں اٹھا کر دیکھیں۔ ان مصنفوں پر افسوس ہوا جو غیر طلب کیے اپنی کتابیں مختلف لابریریوں کو تحفناً بھیجتے رہتے ہیں۔ لابریریوں میں اس طرح سے بھی ہوئی کتابوں میں سے زیادہ نر کا یہی حشر ہوتا ہے۔ مس پیرسن نے مجھے متوجہ دیکھ کر خدا جانے صحیح صورت حال بیان کی یا میرا دل رکھنے کے لیے وجہ یہ بیان کی کہ یہ کتابیں ایک سے زیادہ تعداد میں ہمارے پاس ہیں اس لیے فالتو کتابوں کو ہم نے الگ کر دیا ہے۔ اس انبار میں سے احمد خاں نے اپنی پسند کی بعض کتابیں جپن لیں۔ وداردو سو ساتی آف امریکہ ایند کینیڈا میں اردو کی ایک لابریری قائم کر رہے ہیں۔

یہاں خاصاً وقت صرف ہوا۔ اب بھجوک لگ رہی تھی۔ احمد خاں ایک ریشور میں لے گئے۔ اس کے بعد بہت دیر تنک باغات میں ہم لوگ گھومتے رہے اور رات کے کوئی دس بجے گھر پہنچے۔

(۳۰)

پھر نار تھا ایسٹرن الی نائے یونی درستی میں

اُج صحیح نوبتے نار تھا ایسٹ الی نائے یونی درستی میں میرا پیچھر تھا "انڈن لٹریچر کے موہنیوں پر" پروفیسر اسد حسین نے اس کے بارے میں . . . "برکلر جاری کر دیا تھا اس یہے ایشین ایزز لکب کا بال جہاں پیچھے ہونا تھا بھرا ہوا تھا۔

یہاں فاصلے اس قدر زیادہ ہیں اور صحیح دفتروں کے اوقات میں سڑکوں پر ٹریفک کی وہ بھرمار ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ صحیح سائز ہے سات بیجے ڈاکٹر فور شید کے بھائی سلطان صاحب مجھے اپنی گاڑی میں لے کر روانہ ہوئے اور جب ہم یونی درستی پہنچنے تو نونع کے پارخ منٹ ہو پکے تھے۔ ایشین ایزز لکب تک پہنچنے پہنچنے پارخ منٹ او، گزر گئے۔ گویا میں دس منٹ لیٹت تھا۔ مجھے اس پر اپنے دل میں جوشمندگی محسوس ہوئی۔ بیان نہیں کر سکتا۔ میں اس قسم کے موقعوں پر وقت کی پابندی بہت ضروری سمجھتا ہوں خواہ ملک کے اندر ہو خواہ ملک کے باہر اور ملک کے باہر تو اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ ملک کی ابرو کا سوال ہوتا ہے۔

بہر طور پر میں پہنچ کے میں نے معذرت کے ساتھ پیچھر شروع کیا۔ پیچھر کوئی پچیس منٹ تک رہا۔ دس منٹ سوالات و جوابات میں ضرف ہوئے۔ سوال کرنے والوں میں ہندستانی بھی تھے پاکستانی بھی اور دوسرے ممالک کے طلبہ بھی۔ اس بات سے دل مسٹر ہوئی کہ ہندستان کے معاملات بالخصوص ادبیات میں یہاں کے طبق خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

پیچھر کے بعد پروفیسر اسد حسین نے یونی درستی کے اکٹر اساتذہ سے ملاقات کرائی۔
ڈاکٹر رینالڈ فیلڈ مین (Dr. Reynald Feldman) ڈین سنٹر آف پروگرام دی یونیورسٹی
تو خود پیچھر میں موجود تھے اور انہوں نے ٹیکوئر کی شاعری کے متعلق دو سوال بھی کیے تھے۔

Dr. Vincent malek

پیغمبر سے فارغ ہو کر سب سے پہلے ہم ڈاکٹر و نسٹٹ ملک
 ڈین اف گر تجویٹ کالج سے ملنے کے لیے گئے۔ یہاں گر تجویٹ کالج سے مراد ہے پوسٹ گر تجویٹ
 اسٹڈیز۔ ان کا کام زیادہ تر ایڈمنیسٹریشن کا ہے۔ انھوں نے جموں یونیورسٹی کے بارے میں
 مجھ سے بہت کچھ پوچھا اور نارتھ ایشن الی نائٹ یونیورسٹی کے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا۔
 انھوں نے بتایا کہ ان کی یونیورسٹی کی ابتداء میں سال پہلے یونیورسٹی ان بیس برسوں میں
 طلبہ کی تعداد با میس ہزار تک پہنچی ہے اور جب کہ کمپس کے طول و عرض میں اتنا فہرست ہے
 شعبوں کی تعداد میں بھی اتنا فہرست ہوا کہ اور طلبہ اور طالبات کی تعداد میں بھی۔

ان کے بعد ہم یوں ڈاکٹر احمد نذریہ سے ملے۔ احمد فہد مصری ہیں اور وہین اف کالج
 اف آج کیش میں۔ کالج اف آج کیش سے مراد ہے ڈپارمنٹ اف آج کیش۔ انھوں نے
 اپنی یونیورسٹی میں آج کیش کی درس و تدریس کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور دو ضخیم
 کتابیں عنادت کیں۔ میں نے سوچا تھا یہ کتابیں جموں یونیورسٹی میں اپنے ریق کارڈ اکٹ
 غلام رسول صدر شعبہ تعلیمات کو پیش کروں گا میکن یہ دونوں کتابیں میں پروفیسر اسد حسین
 کے دفتر میں مجھوں آیا۔

یہاں سے چل کے ہم دونوں ایکٹنگ ڈین کالج اف آرٹس اینڈ آج کیش ڈاکٹریل بی کائز
 کے دفتر میں پہنچے۔ ڈاکٹر گارٹر نے کہا کہ ڈین بننے کے بعد وہ بہت زیادہ مهدوف ہو گئی میں۔ درس
 و تدریس کا کام کرنے کے ساتھ ہی صدر شعبہ اور صدر شعبہ کے ساتھ ڈین بننے سے کام اتنا بڑھ
 گیا ہے کہ شتم ہونے میں نہیں آتا۔ میں نے ان کی رائے کے ساتھ اتفاق کیا کیونکہ میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے
 اور یہ ایک حقیقت ہے کہ درس و تدریس اور انتظا میہ امور دو مختلف نوعیتوں کے کام ہیں۔ درس
 و تدریس کے کام سے دلپی رکھنے والوں کو اگر انتظا میہ امور میں الجھاد بیاجائے گا تو اس کام کو نقصان
 پہنچنے کا جس کے لیے ایک استاد یونیورسٹی میں مقرر کیا گیا ہے۔ پروفیسر اسد حسین اس سلسلے میں
 میرے ہم خیال نکلے وہ پولیٹکل سائنس کے شعبے میں پروفیسر میں اور اس شعبے کے ایک ایسوں
 ایٹ پروفیسر ڈاکٹر جان مرفن (Dr. John Murphy) صدر شعبہ ہیں۔ اسد حسین

اس صورت حال سے بہت مطمئن ہیں۔ ڈاکٹر جان مرفن خود مجھ سے ملنے کے لیے پروفیسر اسد حسین
 کے کمرے میں آئے تھے۔ ان کے ساتھ کافی دیر نک باتیں ہوتی رہیں۔ شعرو ادب سے انھیں
 خاصی دلپی ہے۔ انھیں اندیشہ ہے کہ انجام کار سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے شرداد پ کو

بہت نقصان پہنچ گا۔

اسد حسین نے کمپس کے اس سفر میں پروفیسر موہن کے سود سے بھی ملوایا۔ پروفیسر سود کا تعلق چندی گڑھ سے ہے اور وہ یہاں Chairman of the Earth Science Department.

جیس۔ اس طرح متعدد اور اسامنہ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ آج دن کے کھانے کے لیے میں یونیورسٹی کا مہمان تھا۔ چنانچہ کھانا پروفیسر اسد حسین اور پروفیسر موہن سود کے ساتھ میں نے یونیورسٹی کے ڈائٹنگ روم میں کھایا۔

اسد حسین اس یونیورسٹی کی ایک ممتاز علمی شخصیت ہیں اور ان کے کام کو یونیورسٹی میں بڑی قدر کی تقدیر کی جاتا ہے۔ طلبہ اور طالبات کے ساتھ ان کا سلوک دوستاز ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ طلبہ اور طالبات دل سے ان کی عزت کرتے ہیں۔

کھانے کے بعد میں اور اسد حسین دونوں ڈاکٹر دینی اللہ خاں سے ملنے پریٹ ویٹ یونیورسٹی پہنچے۔ وہاں ان سے اور مدھوجی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں اسد حسین تو وہاں سے رُخت ہو کے اپنے گھر کو روانہ ہوئے اور میں ڈاکٹر خورشید کے بھتیجے عدنان اور طارق کی معیت میں نیسم مرد رکھر کے گھر پہنچا۔ سرو را بھی دفتر سے واپس نہیں آئے تھے۔ بیٹی نصرین اور زپخ اور منغان وہاں موجود تھے۔ نصرین نے میری بیوی اور بیٹی کے لیے تھالف دیے۔ اپنے عزیزوں کی یہ محبت میرے لیے بخوبی گراں ملیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج رات کو ڈاکٹر اختر حسین کے ہاں دعوت تھی اور ہر دعوت کے پریٹ میں مشاعر دتو ہوتا ہی ہے۔ وہاں بھی دعوت کے بعد شروع نشست تھی جو بارہ بجے تک رہی۔ اس نشست میں سرو نیسم، افتخار نیسم، نصرین اور ارمغان بھی آئے اور افتخار میرے لیے وہ ام تھالف بھی لائے جو چند روز قبل انہوں نے اپنے گھر میں مجھے دیے تھے اور جو میں اس لیے اپنے ساتھ نہیں لاسکا تھا کہ بہت وزنی تھے۔

(۳۱)

شکاگو سے واشنگٹن

آج شکاگو میں میرا آخری دن تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کے طیارے سے مجھے واشنگٹن

روانہ ہونا تھا۔ رات کو کوئی دونبھے ہم لوگ دعوت سے گھر واپس پہنچنے تھے اس لیے صحیح انکھی دیر میں کھلی۔ اب چونکہ واشنگٹن کے بعد مجھے نیو جرسی، فلاڈ لینیا، نیو یارک اور لندن جانا تھا اور شکا گو واپس آئے بغیر ہندستان روانہ ہو جانا تھا اس لیے سامان کی مکمل پیکنک ضروری تھی اور سامان کی صورت یہ تھی کہ اگرچہ کتابوں سے بھرا ہوا بکس جو ہندستان سے میں اپنے ساتھ لایا تھا خالی ہو چکا تھا لیکن تھائے کی وجہ سے دونوں سوٹ کیس اب کم پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر خورشید ملک کی بیکم میری یادی کے لیے تھائے پہلے ہی مرحمت فرم اچکی تھیں میکن جب ڈاکٹر خورشید نے دیکھا کہ تمام اصحاب کے تھائے میرے بکسون میں نہیں سمارہ ہے ہیں تو انہوں نے ایک ٹری اسٹ کیس میں مجھے دیا اور میں اس طرح دوستوں کی محبت کے مختلف ہمہ لوگوں سے لدا پہندا امپر پورٹ کو رد آ رہا۔

رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور اس وقت بھی بارش اچھی خاصی ہو رہی تھی۔

میں اسی بارش میں عزیزان محترم عدنان اور طارق کی میمت میں اپر پورٹ پہنچا تھوڑی دیر میں ڈاکڑا صی اللہ خاں چانسلر ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی اور ڈاکٹر مدد حسین ڈین آف اکیڈمک انیزد ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی تشریف لائے۔ ڈاکڑا صی اللہ خاں اور ڈاکٹر مدد حسین میرے لیے واشنگٹن کا مکتب بھی لائے تھے اور تھائے بھی۔ میں نے دونوں چیزیں شکر پر کے ساتھ قبول کیں۔ ابھی اُن سے با تیس بھروسی رہی تھیں کہ عزیزان الرحمن صاحب اپنی بیکم عشرت نشاط صاحبہ کے ہمراہ اپر پورٹ پر پہنچ گئے۔ عزیزان الرحمن صاحب نے اپنے سیلی ویژن کے لیے چند روز قبل مجھ سے دو انٹر ویو لیے تھے۔ آپ ان دونوں کے ویڈیو پیپ میرے لیے لائے تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب تھا اور مجھے ویس خیال آیا کہ ہندستان پہنچ کے میں یہ سری نگر سیل ویژن سفر کے لیے مظہر امام کے حوالے کر دوں گا۔ وادی کشیر میں میرے احباب امریکہ میں اردو کے متعلق میری سرگرمیاں دیکھ کے خوش ہوں گے۔ ان دونوں انٹر ویوز کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں کے لیے جہاں اردو پڑھاتی جاتی ہے ان کی نقول تیار کی جائیں گی۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ جہاں اردو پڑھاتی جاتی ہے ان کی نقول تیار کی جائیں گی۔

اسی لیے ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں جو منشائیہ میری صدارت یہ ۵ ستمبر کو منعقد ہوا تھا اس کا ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی میں جو منشائیہ میری صدارت یہ ۳۲ ستمبر اور ۲۹ ستمبر کے انڈو پاکستان کے مشاعرے کے ویڈیو پیپ کی پیش کش ڈاکٹر خورشید ملک کی طرف سے ہے۔

یہ تمام نہ پہ بھجے اگرچہ ہندستان میں ملیں گے لیکن ان کا انتظار بھی سے ہے۔ چند محوں بعد طیارے کی روائی کا اعلان ہوا اور میں تمام احباب اور کرم فرماؤں سے مل کر طیارے کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت بھجے ایسا محسوس ہو رہا تھا جس سے شکا گو میں پیرا قیام چند محوں ہی میں ختم ہو گیا ہوا اور واقعی یہی کیفیت تھی۔ یہ تین ہفتے تین محوں کی نیزی سے گزر گئے۔

بُرْرِ سَايَةَ بَلْ خَوَاتِمَ كَرْ مَے نُوشَّهْ
زَشِيشَرَ تَابَرْ قَدْحَ زَكْنَمَ بَهَارَ گَزْشَتْ

اب کے میرا سفر ڈیلیو۔ اے کے طیارے سے تھا۔ اس سے قبل امریکہ کے اندر میں نے یونائیٹڈ ایر لائنز اور امریکن ایر لائنز کے طیاروں میں سفر کیا تھا۔ ان تمام ایر لائنز کی سروس نہایت عمدہ ہے اور اگر کہوں کہ ماوراء تعریف ہے تو غلط نہ ہو گا۔ خدا کے فضل و کرم سے بھجے مشرق و مغرب کے اکثر ایر لائنوں کے طیاروں میں سفر کرنے کا موقع ملا ہے اور بھجے یہ کہتے ہوئے اگرچہ شرم اور ہی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں انہوں نے ایر لائنز کی سروس کو قابل تعریف نہیں کہ سکتا۔ دنیا میں بعض ایسی ایر لائنز بھی ہیں جن کی کارگزاری قابل تعریف نہیں ہے اور انہوں نے ایر لائنز کا شمار بھی اسی ہی ایر لائنز میں ہے۔ کاش انہوں نے ایر لائنز امریکہ اور روس کے معیار تک پہنچ سکتی۔

طیارہ وقت مقررہ پر چلا۔ بارش کی وجہ سے سردی ڈرھ کی تھی لیکن ایر پورٹ اور طیارہ چونکہ ایر کنڈ پشنڈ تھے اس یہ سردی کا احساس نہ ہوا۔ ہال باہر بادلوں نے جھادوںی چھار کھی تھی اور ساتھ ہی بارش بھی چونکہ ہو رہی تھی اس یہ اس بات کا کچھ اندازہ ہونا رائج کر باہر سردی کی کیا کیفیت ہو گی۔

یہ سفر کوئی ڈرھ کھنٹے کا تھا۔ سارے ہے بارہ بجے میں شکا گو سے روانہ ہوا تھا اور جب واشنگٹن پہنچا تو میری گھڑی میں دونوں رہے تھے۔ میں یہ بھول ہی گیا کہ اب میں مغرب سے مشرق کو سفر کر رہا تھا اور اب مجھے گھڑی کی سویوں کو آگے کرنا ہو گا۔

یہ واشنگٹن ہے۔ دنیا کی دو پر پادری میں سے ایک کا دار الحکومت۔ یہ احساس بھجے واشنگٹن کی سر زمین پر پانوڑ رکھتے ہی ہوا اور مجھے فوراً اخبار آیا کہ اگر امریکہ اور روس دونوں پر پادری میں دوستی ہو جائے تو دنیا کا مستقبل کتنا روشن ہو جائے۔

شکاگو سے چلتے وقت ڈاکٹر خورشید ملک نے مجھے بتا دیا تھا کہ واشنگٹن کے ایرپورٹ پر مژرا سلم مجھ سے میں گئے چنانچہ طیارے سے باہر آنے کے بعد جب میں اپنے سامان کا انتظار کر رہا تھا تو اسلام صاحب شریف نے آئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ پتا چلا کہ ان کا تعلق لاہور سے ہے۔ یہاں واشنگٹن تعليم کے لیے آئے تھے۔ یہاں سے ایم۔ اے کیا۔ کمپیوٹر کی اغاڈا تعليم پائی۔ پہلے یہاں ایک دفتر میر کام کیا اب اپنا کار دبار کرنے میں اور ایک بہت بڑی ٹریول ایجنسی کے مالک ہیں۔ بہت خوش خلق انسان ہیں۔

واشنگٹن پہنچتے ہی ان کی معیت میں سیر کی ابتداء ہو گئی۔ دو چار منٹ ہی میں گاڑی نرپٹا مک Potamic نامی ایک دریا کو عبور کیا تو اسلام صاحب نے بتایا کہ اب ہم درجنیا نامی ریاست میں ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی خود کسی ریاست میں نہیں ہے نہ ہی اس کا اپنا نظام امریکہ کی ریاستوں کا سا ہے بلکہ یہاں کی کارپوریشن ہی اس شہر کی حکومت ہے۔ اسے واشنگٹن ڈسٹرکٹ آف کولمبیا (واشنگٹن ڈی سی) کہتے ہیں۔ بس یہ ایک ڈسٹرکٹ ہی ہے لیکن اسے ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کیوں کہتے ہیں یہ بات بیری سمجھو یہی نہیں آئی۔ دیسے اس واشنگٹن کے ساتھ جو امریکہ کا در الحکومت ہے کوئی اور لفظ ملانا ضروری تھا جس سے اس کی تخصیص برقرار رہتی کیونکہ امریکہ میں واشنگٹن نام کی ایک ریاست بھی ہے جو اس واشنگٹن سے بہت دور ہے اور امریکہ کے مغربی ساحل پر ہے لیکن اس کے باوجود ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کی وجہ تسمیہ سمجھو یہی نہ آئی۔

چند منٹ میں ہم نے مذکورہ دریا پوتا مک کو دوبارہ عبور کیا اور ہم پھر واشنگٹن میں تھے۔ یہاں سب سے پہلے اسلام صاحب نے امریکہ کی دو اہم عمارتیں دکھائیں۔ یو۔ ایس۔ کیپیٹل اور وھائٹ ہاؤس۔ کیپیٹل ایک طویل سلسلہ عمارت کا نام ہے جس میں کانگرس اور ریاست کے دفاتر ہیں۔ وھائٹ ہاؤس صدر امریکہ کی قیام گاہ ہے جس کے ساتھ ملحقہ ان کا سکریٹریٹ ہے۔

وھائٹ ہاؤس ہمارے راشٹرپتی بھون سے بہت ہی چھوٹا ہے اور عالم بھر کا راشٹرپتی بھون سے بہت کم رقبے میں واقع ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر دھن ملحقہ عمارتیں شامل کر دی جائیں جن میں صدر امریکہ کا سکریٹریٹ ہے تو سارے کمپلیکس کا رقبہ خاصاً سیع ہو جاتا ہے۔ مُناہے اس کی basement

اور بہت ہی طویل و عریض ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ یہ ساری عمارت بھم پروف ہے۔ یہ عمارت سیاحوں کے لیے بھی بعض دنوں میں کھلی رہتی ہے میکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس ساری عمارت کو تفصیل سے دیکھ سکتا اور اتنا وقت تو بھی بھی نہیں مل سکا کہ کسی شہر کو یا کسی شہر کی قابل ذکر عمارت کو تفصیل سے دیکھ سکا۔ ماسکو میں کریمین اور یونیورسٹی میوزیم کی بس ایک جھلک ہی دیکھی۔ لندن میں برلش میوزیم، پیرس میں لودرے، قاہرہ میں الازہر اور قطبہ میں مسجد قطبہ کی بس ایک جھلک سے زیادہ کیا دیکھ سکا۔ لاہور کے عجائب گھر کو بھی اول سے آخر تک کہاں دیکھا ہے۔ دہلی کو بھی کہاں پوری طرح سے دیکھ پایا ہوں۔ زندگی کے لیے ایک محلی، ایک تمسم، ایک نگاہ بند نواز، ہی بہت ہے،

لابربری اف کانگریس کو صرف باہر تھے سے دیکھا، معادم ہوا کہ آپ کو جو کتاب درکار ہو اس کا نام کٹیڈیاگ میں دیکھیں۔ اور پھر اپنے قرب لگئے ہوئے۔ ٹننوں میں سے ایک خاص ٹن دبائیں۔ کتاب لابربری کی جس منزل اور جس کرے میں بھی ہو گی کہیوں کے ذریعے سے خود خود آپ تک پہنچ جائے گی۔

یوں تو تفصیل سے دیکھنے کی چیزیں بہت تھیں مگر میوزیم اف پھرل ہسٹری، میوزیم ہسٹری اف ٹیکنا لو جی، نیشنل گیلری اف آرت، ہر سکارن میوزیم اینڈ اسٹلپر گارڈن، فورڈز تھیٹر، اور یہ سب کوئی دور بھی نہیں تھے میکن میں نے ان سب میں سے نیشنل ایک اینڈ اسپیس میوزیم کا انتخاب کیا اور پچھہ وقت اس میں بس رکھا۔

اسے اول سے آخر تک اور اوپر سے پنج تک دیکھنا محال ہے۔ اس لیے اسلام صاحب کی رہنمائی میں اس کے بعض حصے دیکھے۔ کہیں بھی چاندہ را اتر جی بے کہیں آرم اسٹرانگر نیل چاند کی سر زمین پر قدم رکھ رہا ہے۔ اسپیس یہ سارے کا ^{replica} بھی دیکھا اور ماؤل بھی۔ ماؤل تو خیر ماؤل ہے جھوٹے سائز کا میکن ^{replica} دیکھ کے تو عتل و نگ رہ جاتی ہے۔ کتنا بڑا کارخانہ انسان کی عقل و فرد نے خلا میں روشن کر دیا۔ یا منظر العجائب! اس ہوال جہاز کا ^{replica} بھی موجود تھا جس نے سب سے پہلے ہی امریکتے انگلستان کا سفر کیا بلکہ اس میوزیم میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے ہی اپ کا ^{replica} استقبال کرتا ہے اور اس سے بھی قبل چاند سے لائی ہوئی ایک چنان کاملاً۔

اس میوزیم کی ہر منزل پر مستعد فلمیں چل رہی تھیں جو غلامیں ابن آدم کی پرواز کی

داستان سنار ہی تھیں۔ چاند پر آترنے کی بات تو اب پڑا نی ہو چکی اب تو زحل (Saturn) اور مرتع (mass) انسان کی نظر میں ہیں۔ اس سلسلے میں خوبی کا سیاہی یا ناکامی ہو چکی ہے وہ سب فلم کے پردوں پر ہماری نظر کے سامنے تھی اور مجھے بار بار اقتقال کا یہ شریاد آ رہا تھا
 زندگی اسماں بگزر زندگی کہکشاں بگزر
 زمزمل دل بمیرد گرچہ باشد مزلہ لہاہے

خدا کے فضل سے اسلام صاحب کا کار و بار بہت عمدہ ہے اور اسی باعث وہ بہت مہروف رہتے ہیں چنانچہ بیپر ان کی (beepa) ان کی جیب میں رکھا رہتا ہے۔ شکا گو میں یہ بیپر ڈاکٹر خورشید ملک کی جیب میں دیکھا تھا۔ یہاں اسلام صاحب کے پاس بیپر جیب میں ہو تو اب شہر کے کسی حصے میں بھی ہوں اپ کے گھر کے یاد فرٹ کے لوگ اپ کو بتا سکتے ہیں کہ اپ کے پاس کیا ہے۔ چنانچہ اپ بیپر پر اواز شستے ہی قرب ترین سے گھوڑی میلی فون کر کے پوچھ سکتے ہیں کہ کس کا میلی فون ہے اور میلی فون کرنے والے کے ساتھ بآسانی بات کر سکتے ہیں۔ جس وقت ہم لوگ اس میوزیم کی سیر کر رہے تھے تو اچھا نیک اسلام صاحب کی جیب میں رکھا بیپر بخشنے لگا چنانچہ وہ قرب ترین بو تھے سے اپنے دفتر میں میلی فون کرنے لگئے۔ میں ان کی عیز حاضری میں میوزیم کے مختلف حصوں میں لمحہ متارہ۔ اس طرح پھرتے پھرتے جب ہم واشنگٹن میموریل تک پہنچنے تو سوچا کہ لفت میں بیٹھ کر اور پر جائیں اور سارے واشنگٹن کو ایک نظر دیکھیں۔ یہ میموریل پائیں بجے نیک کھلا رہتا ہے۔ اس وقت میری گھر میں ساڑھے چار بجے تھے۔ سوچا ادھر گھسنے نظر۔ خوش گز رے کے لیے بہت ہے لیکن پتا چلا میری گھر میں ابھی تک شکا گو کا وقت دے رہی ہے اور واشنگٹن میں ساڑھے پائیں بجے پہنچے ہیں۔

اسی دوران میں اسلام صاحب نے بتایا کہ میرا دن کا کھانا لکھنؤ کی ایک خاتون سنگیتا جی کے گھر پر ہے اور وہ میرا اور ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کھانا تو میں طیارے میں کھا چکا ہوں اور اب رات کو جا کے کہیں بھوک لگئی کی لیکن جب پتا چلا کہ میرے انتظار میں اسلام صاحب نے بھی کھانا نہیں کھایا تو میں برائے نام ساتھ دینے کو آمادہ ہو گیا۔

سنگیتا جی کے گھر پہنچے اور کھانے کی میز پر بیٹھے تو دیکھا کہ انہوں نے طرح طرح کے کھانوں سے بیز بھردی ہے۔ یہاں ایک لمحے کی بھی گنجائش نہیں تھی لیکن ساتھ دینا ہی تھا۔ دو تین

پچھے سالن کے لیے اور پلیٹ بھر گیا۔ سنگیتا جی بہت مہمان نواز واقع ہوئی ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ میں فزور کھاؤں چنانچہ انھوں نے میری پلیٹ بھر دی۔ افسوس کہ میں ان کے ارشاد کی تعمیل نہ کر سکا اور پلیٹ میں رکھا ہوا کھانا صفائح ہو گیا۔ ہم ہندستانی کھانے کا ایک نقرہ بھی صفائح نہیں کرتے لیکن یہاں امریکہ میں کھانا صفائح کرنا بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں ہو چیز کی فراوانی ہے۔ دودھ وہی اور کھانے میں کی دوسری چیزوں والے بلاشک کے نہایت خوبصورت اور قیمتی خالی ڈبے کوڑے میں پھینک دیے جاتے ہیں۔ بلاشک کے گلاس، پچھے، پلٹیں، تھہری، کاشٹے، ایک بار استعمال کرنے کے بعد دوسری بار استعمال نہیں ہوتے۔ پھینک دیے جاتے ہیں۔ یہاں نہ کوئی خالی بوتیں خریدنے والا ہے نہ خالی ڈبے خریدنے والا نہ ردی خریدنے والا۔ اخبارات کی روی گھر سے انھوں نے کے لیے آپ کو جیب سے روپیا دینا پڑتا ہے۔ اس لیے امریکہ میں رہ کے اخبار نہ ہی خرید میں تو بہتر ہے۔ جب آپ کے گھر کے ہر کربے میں یہی دیڑن موجود ہے تو خبر میں یہی دیڑن پر سُن لیں اور اخبارات سے بے نیاز ہو جائیں۔ ویسے بھی ہر روز ایک ایک سو صفحے کا اخبار اور اتوار کے دن ڈیڑھ سو صفحے کا اخبار آپ یکے پڑھ پائیں گے۔ اخبار کیا ہے پوری لا تہر بری گھر میں آ جاتی ہے۔

سنگیتا جی کے گھر سے چل کے ہم لوگ حسین امام صاحب کے گھر کو روانہ ہوئے جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ حسین امام صاحب رستے ہی میں مل گئے۔ ان کے ساتھ میں ان کے دولت کدرے بڑھنچا۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ساتھ ان کا تعلق خاطر بہت ہے مسلسلے سے ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے تو پتا چلا کہ حسین امام صاحب میرے عزیز دوست مختار الدین احمد کے بھابھے ہیں۔ اس طرح ان سے ایک مزید قرب پیدا ہو گیا۔ گھر پر ان کی بیگم روشن صاحبہ اور مختار الدین صاحب کی ہمشیرہ صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔

اب رات ہو چلی تھی۔ سنگیتا جی کی مہمان نواز کی نے رہی سہی بھوک بھی ختم کر دی تھی اس لیے کھانے کا تواب سوال ہی نہیں تھا۔ حسین امام کے اصرار پر میں نے دو دھوپیا اور مظہمن ہو کر سو گیا۔

(۳۲)

داشکش میں پہلادن

داشکش میں آج میرے بیٹے ہمیلی صبح طلوع ہو رہی تھی لیکن میں طلوع کے منظر سے لطف اندر فڑنے ہوا کا شکا لوگی دعوت اور شرعی نشستوں نے کو مر نکال دیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ تھکن جسم میں جمع ہو رہی ہے اس لیے رات کو ایسا غافل سویا کہ صبح دس بجے سے بہلے آنکھوں کھل سکی۔ امام صاحب سات بجے اپنے دفتر جا پہنچتھے۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا، ناشستہ کیا اور اپنا سفر نامہ مکمل کرنے بیٹھ گیا۔ جیسیں امام صاحب کو میرے بائیوڈیناکی ضرورت تھی۔ اُسے چند صفحوں میں مرتب کیا۔ جموں اور سری نگر خطوط لکھے۔ جو وقت پہا اس میں سفر نامے کے نامکمل حصوں کو مکمل کیا۔

اسی دوران میں روشن صاحب نے مکان کے لان وغیرہ دکھائے۔ خوبصورت لان۔ نرم دنازک دوب سے ڈھکا ہوا۔ ایک گوشے میں سبب کا درخت۔ سببوں سے لدا پھندا۔ اس پاس کا ماحول انتہائی خوبصورت یہ سے عالم تصویر ہو۔ لطیف ہوا، لطیف فضنا۔ اتنے میں سارے چار بجے گئے اور جیسیں امام صاحب دفتر سے واپس تشریف لے آئے۔ ود میرے بیٹے داشکش کے بارے میں خوبصورت لڑپھر لائے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار بھی تھا۔ دکی داشکش پوست۔ پورے سو صفحات پر مشتمل۔ میں نے چند موٹی مولی فبروں پر نظر ڈالی۔

امام صاحب دفتر سے واپس ہگر سارے چار بجے کھانا کھایتے ہیں۔ رات کا کھانا۔ ناشستے کے بعد میں نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ آج جمجمہ تھا اور جمیع کے روز مہماں ایک قربی مسجد میں درس قرآن کے سلسلے میں ایک مجلس منعقد ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں امام صاحب نے قرآن کے بیٹے مسجد کا رخ کیا۔

آن کی بیگم، مختار الدین صاحب کی ہمشیرہ اور پچھے بھی ساتھ گئے۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ امام صاحب کی لائبریری میں رکھی ہوئی کتابیں دیکھنے لگا۔

اسی شغل میں تھا کہ میلی فون کی گھنٹی بجی۔ چونکہ گھر میں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے ریپورٹ ٹھاپا۔ یہ نیو یارک سے سفر فتح پوری کا میلی فون تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ واشنگٹن کے مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں اور مشاعرے کے بعد مجھے اپنے ساتھ نیو یارک لے جائیں گے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں براہ راست نیو یارک نہیں جاسکوں گا کیونکہ ہندستان واپس جانے سے قبل پروفیسر حفیظ ملک سے میرا ملتا ہزوڑی ہے۔ پروفیسر حفیظ ملک فلادنیا میں ہیں اور میں اگر ان سے ملنے کے بعد میں خود نیو یارک پہنچ جاؤں گا اگرچہ فلادنیا کے بعد رستے میں ایک منزل اور بھی ہے اور وہ ہے نیوجرسی۔ نیوجرسی کی بزم ادب نے ایک مشاعرے کا پروگرام رکھا ہے ۲۰ کی رات کو۔

(۳۳)

واشنگٹن میں مشاعرے

آج کا دن گھر ہی پر گزرا۔ شکاگو کے سفر میں خلیق قریشی مرحوم بہت یاد آئے تھے۔ سرورِ نیم اور افتخار سے قریب ہر دوسرے تیرے ملاقات ہو جاتی تھی اور خلیق مرحوم کا ذکر چل نکلتا تھا۔ شکاگو سے چلا تو ان کی یاد میں ایک نظم ہو گئی تھی۔ آج وہ نظم کاغذات میں سامنے آگئی۔ اُسے صاف کیا اور ایک خط کے ساتھ نسرين بیٹی کو سمجھ دی۔

دو پھر کے وقت ایر پورٹ سے ایک میلی فون آیا۔ پنا چلا کہ کلیم عاجز آگئے ہیں۔ کوئی دیکھنے بعد وہ حسین امام صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ فردوسی صاحب نے میرے لیے آن کے ہاتھ چند اور تصویریں بھی تھیں۔ یہ تصویریں اُس دن کی سیر پر مشتمل تھیں جب قتیل شفافی،

سید حمیر جھری، افتخار نیم، فدوی صاحب اور اس خاکسار نے صبح سے رات تک شکاگو کی سیر کی تھی۔ سڑکوں اور بازاروں کو بھی چھانڈا لاتھا اور یک مشینگ کے کناروں کو بھی۔ ڈاکٹر خورشید مدنگ نے میری ایک اور پسندیدہ کتاب American war of Independence. بھی میری درخواست پر میرے لیے بھیجی تھی۔

ڈاکٹر کلیم عاجز سفر کے مول ملے میں پارٹا اس طراط واقع ہوئے ہیں۔ بارہا طریقیں ہیں بہت کم بولتے ہیں، بہت کم کھاتے ہیں اور بہت کم سوتے ہیں۔ مشاہدہ ان کا بہت جامع ہے۔ اکثر غور و فکر اور مطاائعے میں غرق رہتے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید مدنگ کے بہاں ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہے۔ ان کی موجودگی کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ نماز کے بہت پابند ہیں اور ان کی اس پابندی کی بدولت کرے ہیں ایک روحانی فضائی کا عالم رہا۔ سگریٹ دن یہ ایک یادو سے زیادہ نہیں ہیتے اس لیے ان کے واسطے جو سگریٹ آتا تھا وہ بھی دراصل میرے ہی کام آتا تھا اگرچہ میں سگریٹ کے مقابلے میں سکار کو ترجیح دینا ہوں لیکن سگریٹ بھی اگر مفت ماتھو آئے تو بُرہا کیا ہے۔

آج رات کو مشاعرہ تھا۔ جب حسین امام صاحب کے ساتھ مشاعرہ کاہ میں پہنچے تو پتا چلا کہ یہ واشنگٹن نہیں ہے بلکہ ریاست ورجینیا کا ایک شہر اور نگاشن ہے دراصل آس پاس کے یہ تمام شہر مثلاً ارنگاشن یا فائز چرچ و میزہ واشنگٹن ذی سی کی حدود سے باہر ریاست ورجینیا ہی میں سہی لیکن دراصل واشنگٹن ہی کے مضافات ہیں جسے ہمارے یہاں غازی آباد اور سونی پت بالترتیب پول اور بہرپانہ میں ہوتے ہوئے بھی ایک طرح سے دہلی ہی کے مضافات سمجھتے جاتے ہیں۔ اور پھر واشنگٹن کا ضلع بھی تو دراصل ریاست ورجینیا اور ریاست میری یمنڈ کے حصے کر بنایا گیا ہے جسے ہمارے یہاں چنڈی گڑھ بھی اور بہرپانہ کے حصے کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

مشاعرہ اچھا تھا۔ اس میں محمد حنیف اخگر بیج آبادی (نیو یارک)، ڈاکٹر مظفر شکوہ (نیو یارک)، احتشام کاظمی (نیو یارک)، رشید دعیاں (نیوجرسی)، اعجاز احمد (کنیکٹ کٹ)، دانش تریمین ہنا (ورجینیا) حسین امام (واشنگٹن)، ڈاکٹر کلیم عاجز اور راقم التحریر نے کلام سنایا۔ حسین امام صاحب نے شوارکا تعارف کرایا اور تریمین ہنانے مشاعرے کے کارروائی کو چلایا۔ رشید دعیاں کا نام اور کلام میں نئے ہیلی بارہنا اور ان کا کلام مجھے

پسند آیا۔ اس وقت تک اردو کے جن امریکی "پا" کینیٹھن "شوار کے کلام نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ہے ان میں چار نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور وہ ہیں افتخار نیم اشکا گو، خالد خواجہ (شکا گو) نزہت صدیقی (لورڈ ٹھو) اور رشیدہ عیاں (نیوجرسی)۔ مشاعرے کی صدارت اسد الرحمن (نیویارک) نے کی۔ مشاعرہ ہر اعتبار سے کامیاب تھا اگرچہ سامعین کی تعداد کم تھی جیسین امام صاحب اور اسلم صاحب اس کا میباہی پر مبارک بار کے مستحق ہیں۔

(۳۴)

در سے گزر گیا ہے کوئی بن صدائے

آج صحیح کو بیدار ہوئے تو آسمان ابر آؤ د تھا۔ کل دن بھر دھوپ جمپکتی رہی سیکن اس کے باوجود سردی رہی۔ آج سردی کل سے زیادہ ہی تھی۔ ناشترے کی میز پر آج مجمع احباب تھا۔ کلیم عاجز اور میرے علاوہ انجاز احمد تھے۔ ان کی بیگم اور زوجہ بھی۔ رشیدہ عیاں تھیں اور ان کی بہن بھی۔ حسین امام، ان کی بیگم، بیٹی اور مختار الدین احمد کی بہن شرہ تو ہمارے میزبان تھے ہی۔ کہیں مشاعرہ ہو تو مشاعرے کے دنوں میں کھانے اور ناشترے کی میز بھی مشاعرے کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ہندستان اور پاکستان کے شاعروں کے فضیلہ حلتے رہے۔

انجماز احمد کا تعلق لاہور سے ہے۔ اور نشنل کالج لاہور سے انہوں نے عربی میں ایم۔ اے کیا ہے۔ مشاعرے میں کثرت کے لیے کینیکٹی کٹا سے اپنی گاڑی میں آئے تھے۔ کوئی ساز ہے تین سو میل کا سفر لے کر کے۔

آج رات کو نیوجرسی میں مشاعرہ تھا۔ واشنگٹن سے روانہ ہونے لگے تو حسین امام صاحب نے یہ مرشدہ دیا کہ ہم پہلے فلاڈ نیا جائیں گے اور وہاں پر دفتر حفیظ مدنگ سے

ملاقات کے بعد نیو جرسی روانہ ہوں گے۔ میرے لیے یہ ایک مردہ جان فرا تھا اور دوسری مزے کی بات یہ تھی کہ اب نیو پارک تک کا سفر کار کا تھا۔ امریکہ اور یمنیڈا کا سفر اس وقت تک ہوا جہاز کے ذریعے سے ہو رہا تھا۔ اب ایک لمبا سفر کار کے ذریعے طے کرنے سے اس میں ایک تنوع پیدا ہو گیا۔

حسین امام صاحب کا مکان دیسے ہی ایک سرہنگ اور شاداب علاقے میں واقع ہے ہم دہائی سے چلے تو حسین نز مناظر نظر کے سامنے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے اشجار تھے جسے کسی جنگل میں سے گزر رہتے ہوں۔ ٹھوڑی دیر میں ہم دس اور پورٹ کے قریب سے گزرے۔ یہ ایر پورٹ جان فاسٹر ڈس کے نام پر بنایا گیا ہے جو آنzen ہا در کے زمانے میں امریکہ کے ذریعہ خارجہ تھے۔

اس سفر میں گھنے اشجار کی فراوانی نے دونوں ساتھ دیا۔ آخر ایک مقام پر تین پونچ کران میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔ بالکل ایسا ہی نظارہ تھا جسے کشمیر کے پہاڑوں سے گزر کر انسان جھوں کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ حسین امام صاحب نے بتایا کہ اب ہم جنگلوں سے گزر آئے ہیں اور شہر پالٹی مور کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں اس لیے اشجار کی فراوانی میں کمی آگئی ہے۔

پالٹی مور ایک صنعتی علاقہ ہے اور ساتھ ہی ایک دریائی بندرگاہ بھی۔ اس بندرگاہ میں تاحد نظر اشیکر ہی اشیکر نظر آئے۔ ابھی نگاہ اشیکروں کے ہجوم پر ڈکی ہوئی تھی کہ ہماری گاڑی ایک سرنگ میں داخل ہوئی اور جب دیر تک ہم لوگ سرنگ ہی میں روائی دوال رہ تو مجھے باہم سرنگ کی یاد آگئی۔ قریب قریب دیسا ہی نقشاتھا اور جب سرنگ سے ہم باہر نکلے تو پتا چلا کہ اس کی لمبائی ڈھائی میل تھی۔ امریکہ میں ابھی تک میل، گز، فٹ اور اپنچ ہی چل رہے ہیں۔ میٹر کی سسٹم ابھی یہاں شروع نہیں ہوا ہے۔ وزن کا پہیا نہ بھی پونڈ ہی ہے اور موسم کا پہر پھر بھی فارلن مائٹ میں بتایا جاتا ہے۔ ماں کرنی کی صورت یہ ہے کہ سو سینٹ کا ایک ڈائر بنتا ہے سیکین اب سننا ہے کہ آہستہ آہستہ یہاں کا سارا نظام میٹر سسٹم کو اپنانے کی تیاری کر رہا ہے۔

پالٹی مور سے نکلے تو آسمان قریب قریب صاف ہو گیا۔ دھوپ چمکنے لگی اور گرم ہو گئی۔ مناظر کا حسن بھی بڑی حد تک جاتا رہا۔ اب ہم ریاست میری یمنیڈا میں سے گزر رہے تھے۔

شايدا اس ریاست میں گھنے جنگلوں کی کمی ہے یا ممکن ہے جس رستے سے ہم گزرے وہاں گھنے اشجار مقابلتاً کم تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشجار کی فراوانی میں کمی نہ آئی ہو صرف دھوپ کی تیزی نے مناظر کے خُسن میں کمی کر دی ہو۔ بہر طور اس کمی کے باوجود مناظر دیدہ زندگی تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دو دریاؤں کو ہم نے عبور کیا جن کے کنارے خُسن فطرت کے ساتھ ہی ساتھ دستِ انسان اور زہن انسان کے کر شموں کی داستان سنارہے تھے۔

ریاست میری بینڈ کی سرحد عبور کر کے ہماری گاڑی ریاست دلاور (Delaware State)

میں داخل ہوئے۔ دلاور اس ریاست کا سب سے بڑا شہر ہے لیکن دلاور ریاست دلاور کا دارالحکومت نہیں ہے۔ یہاں امریکہ میں یہ ایک طبقہ شدہ بات ہے کہ ریاست کا سب سے بڑا شہر ریاست کا دارالحکومت نہیں بن سکتا۔ اس ریاست کا دوسرا بڑا شہر کنکارڈ (Concord) ہے۔ یہاں تک پہنچنے پہنچنے دھوپ میں خاصی تیزی آچکی تھی اور اگرچہ آج انوار تھا لیکن بازار کھلے تھے اور سڑکوں پر خاصی چہل پہل تھی۔ گرمی کی وجہ سے اس چہل پہل کی دلکشی بس اور اخناو ہو گیا تھا۔ یہاں کہ حُسن نسوانی یہاں پھر بڑی حد تک پڑوں سے بے نیاز نظر آیا۔

کنکارڈ ریاست پنسلوانیا (Pennsylvania State) سے ملحق شہر ہے اس لیے اس سے گزرے تو پنسلوانیا کی حدود میں تھے۔ اب پھر دھوپ چھانو کے مناظر شروع ہو گئے اور مجھے والد محترم کا یہ شعر یاد آگیا جو انہوں نے شملے کے متعدد کہا تھا۔

دھوپ چھانو کے مناظر بھی غضب دھانتے میں
رنگ نیرنگی دو راں کا دکھا جاتے میں

اس وقت ہماری گاڑی ولانووا کو روایا دواں تھی۔ دراصل اب مجھے معلوم ہوا کہ اکثر حفیظہ ملک کا قیام فلاد لفیا میں نہیں ہے بلکہ یہاں یونیورسٹی ہے وہیں ان کا مکان ہے یعنی ولانووا میں اور ولانووا فلاد لفیا کے مضافات میں سے ایک ہے اور امریکہ ایسا ملک ہے کہ مضافات بعض دفعہ مرکزی شہر سے پچاس سانچھو ستر، اسی میل کے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ اسی طرح کی صورت سے دوچار ہونا پڑا۔

گھر سے ہم لوگ ساڑھے بارہ بجے چلے تھے اور خیال تھا کہ تین نکے تک ولانووا پہنچ جائیں گے لیکن چار بجے گئے اور ولانووا کا پستانہ تھا۔ ایک نقشابھی ہمارے رہا باس تھا لیکن

ولانو و اکا پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایک پڑول پمپ پر گاڑی روک کے اُس کا پتا دریافت کیا۔ پڑول پمپ والے نے کہا کہ چیس میل اور آگے جائیے وہاں سے ولانو واکی سڑک آپ کو ملے گی۔ ہم لوگ بیس میل آگے گئے۔ کچھ بتانہ چلا۔ کمی آبادیوں میں سے بھی گزرے اور غیر آباد علاقوں میں سے بھی۔ پھر ایک پڑول پمپ پر گاڑی روکی۔ پتا چلا کہ ہم بہت آگے نکل آئے تھے۔ اُس اور ولانو واکی سڑک چیس میل پیچھے رہ گئی ہے۔ اس وقت تک سارے چار نجی چکے تھے۔ پہلے سے طے کیے ہوئے بر و گرام کے مطابق، میں جھے بخے تک نیوجرسی پہنچنا تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ بادل خواستہ ولانو و اجانے کا ارادہ ترک کیا۔ گاڑی موڑی اور نیوجرسی کا راستہ تلاش کرنا شروع کیا۔ کیونکہ جس مقام پر ہم تھے وہاں نیوجرسی کی ڈائرکشن بھی حسین امام صاحب کو معلوم نہیں تھی۔ انہوں نے ایک اور لفٹا خریدا جس کی مدد سے وہ اُس شاہراہ پر ٹپکنے جہاں سے نیوجرسی کو راستہ جاتا تھا۔ اس طرح سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھٹکتے ہوئے ہم ہرے بھرے اور دھلے دھلانے بزہ زاروں سے بھی گزرے، دو تین دریاؤں کو بھی عبور کیا۔ یعنی طبیعت بشاش نہ ہوئی۔ کسی منظر میں حسن نظر نہ آیا۔ طبیعت اُو اس تھی کیونکہ ایک ماہ قبل جب بیس گھر سے امریکہ روانہ ہوا تھا تو پروفیشنل میک سے ملنے بلکہ ان کے ساتھ ایک دن قیام کرنے کی شدید خواہش دل میں تھی۔ اب یہ خواہش منزل کے قریب ٹپکنے کے بھی تکمیل پذیر نہیں ہو سکی تھی۔ اب کیا کہا جائے اور اس کے محدودی قسم کی شکایت کیجیے۔

بہر طور شام کو سات بجے کے قریب نیوجرسی ٹپکنے کے۔ سلام شاہدی صاحب کے دولت کدے پر دہم لوگوں کے منتظر تھے۔ ہم تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ ما تھو منہ دھویا۔ کھانا کھایا اور ذرا آرام کرنے بیٹھ گئے۔ سلام شاہدی اور ان کی بیگم عذر رانے ہمارے آرام و آسائش میں کوئی دلیل فروگذشت نہیں کیا۔

اسی دوران میں حفیظ ملک صاحب کا فون آیا۔۔۔ وہ شام کے جھے بخے تک مگر پر ہمارے منتظر ہے تھے۔ میں نے انہیں ساری روادوکہ سنائی۔ انہیں بھی اس ملاقات کے نہ ہونے کا اتنا ہی دلکھ ہوا جتنا مجھے ہوا تھا۔ بہت دیر تک میں فون بر بائیں ہوتی رہیں۔ آنکھ بچے شوی نشست شروع ہوئی۔ وہیں، سلام صاحب کے دولت کدے پر۔ صدارت جناب حنیف صاحب انھر کی طبع آبادی نے کی۔ شرما کا تعارف ڈاکٹر مظفر شکوہ نے

کرایا۔ ڈاکٹر حکیم عاجز اور راقم التحریر کے علاوہ ڈاکٹر منظف شکوه، احتشام کاظمی، حسین اسام، حمیرہ رحمان اور صاحبِ صدر جناب اخگر ملحق آبادی نے اپنا کلام سنایا

(۳۵)

نیویارک

کل رات یمنڈنھیک سے نہ آئی۔ سبب یہ تھا کہ ایک تو شری نشست کے بعد گپ شپ کا سلسہ بہت دیر تک رہا۔ دوسرے جب میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو میر پر رکھے ہوئے رسائل کی ورق گردانی کرنے لگا اور یمنڈ انکھوں سے غائب ہو گئی۔ شاید پائچ بجے آنکھوں لگی اور رسات بجے گھل گئی۔ طبیعت اس وقت بچاری تھی لیکن چونکہ نیویارک کی سیر کا پروگرام تھا اس لیے نہادھو کر 9 بجے تک تیار ہو گیا۔ اگرچہ سیر و عیزہ بہت بعد میں شروع ہوئی۔

کوئی دس سارہ ہے دس بجے کے قریب حسین امام اور حکیم عاجز واپس واشنگٹن رو انہ ہوئے آنھیں اوداع کی۔ اس سارے سفر میں ڈاکٹر حکیم عاجز کی ہم سفری نے سفر کو بہت خوشگوار بنا دیا تھا۔ ان کی خوشی میں میرے لیے ہر وقت تکلیم کی کیفیت موجود رہی۔ اس وقت ان سے جدا ہوتے ہوئے دل بہت آداس ہوا اور صورت گویا یہ تھی۔

قیامت ہے کہ ہووے مدنگی کا ہمسفر غائب
وہ کافر خود کو مجھی نہ سوپا جائے ہے ہم سے

بہر طور پر منزل بھی طے ہو گئی اور کوئی بارہ بجے کے قریب سلام شاہدی صاحب مجھے اپنے ہمراہ لے کر نیویارک چلے۔ ماں روانگی سے قبل کئی تصویریں لی گئیں جن میں گھر کے سب لوگ خرچک ہوئے۔

سلام شاہدی صاحب کا مکان نارتھ برنز وک North Burnswick

یہ ہے۔ وہاں سے نیویارک کا فاصلہ چالیس میل ہے۔ اور وہاں وہاں رُکتے رُکاتے یہ

کو لمبیں کے دلیں میں

چالیس میل کی مسافت طے کرنے میں ہمیں کوئی ایک گھنٹہ نہ لگا۔ لگھ سے روانہ ہوئے تو کئی چھوٹے بڑے شہر رہتے ہیں آئے مثلاً بنو برزروک، ایڈیسن، وڈ برجن، کارنر، ایز بندھ وغیرہ۔ یہ چھوٹے چھوٹے شہر کیا تھے اور اراقِ مصوّر تھے اور جو شکل نظر آئی تھویر نظر آئی۔

ابھی نیو یارک دور تھا کہ اس کی فدک بوس عمارتوں نے شہر کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ سلام شاہدی صاحب نے ایک بلند و بالا عمارت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایمپیاٹر اسٹیٹ بلڈنگ ہے اس سے قریب ہی وہ دو Twin Towers نظر آرہے ہیں۔ یہی عمارتیں ساری دنیا کی تجارت کا مرکز ہیں۔

اس وقت ہم دریائے ہنسن کے کنارے پر تھے۔ یہ دریا نیوجرسی کو نیو یارک سے جدا کرتا ہے۔ اس کے پچھے ایک ٹنل ہے۔ لیکن ٹنل Lincoln Tunnel ہماری گاڑی اسی ٹنل میں داخل ہوئی اور ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد جب ہم ٹنل سے باہر نکلے تو نیو یارک میں تھے۔

نیو یارک کا شہر متعدد جزیروں پر آباد ہے۔ ہم جس جزیرے میں داخل ہوئے اس کا نام مین ہنسن (manhattan) ہے۔ یہ جزیرہ یا علاقہ نیو یارک کا دل ہے اور اس علاقے کا دل وال اسٹریٹ ہے جہاں ایمپیاٹر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔ نومن ٹاؤنز ہیں اور جس سے چند قدم پر یوناٹڈ نیشنز ارگناائزیشن کی عمارت ہے۔

ہم اس جزیرے میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے جو علاقہ نظر کے سامنے تھا وہ تھا گپڑے کا بازار Garment District۔ اس بازار میں بڑے بڑے بیوپاری ہندستانی ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ میں جواہرات کی تجارت بھی بڑی حد تک ہندستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ بلحاظ کی طرح۔ یہاں ہندستان کے علاوہ پاکستان، چین اور کوریا سے بھی بکٹرا آتا ہے اور ان ملکوں کے تاجر بھی اس بازار میں موجود ہیں۔

قریب ہی میڈیکل سنٹر تھا۔ یہاں افریوں اور ہسپتاوں سے آباد۔ داکٹر سلام شاہدی یہیں کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنا ایک سینورنٹ بھی چلا رکھا ہے اور اس کے باوجود شرعاً ادب کے مطابعے کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ میڈیکل سنٹر کو جاتے ہوئے ایمپیاٹر اسٹیٹ بلڈنگ کو قریب سے دیکھا۔ اس کے اوپر ایک آبزرور ٹری ہے جہاں سے سارا نیو یارک نظر آتا ہے۔ اسی مرگشیت میں یو این او

Store

کی عمارت کی ایک جھلک دیکھی۔ دنیا کے سب سے بڑے اسٹور کے پاس سے بھی گزرے تھے لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر چونکہ دریا کے ذریعے سے نیویارک کی سیر تھی اس لیے ہم نہیں۔ این کے قریب رُکے اور نہ ہی کے پاس۔ سیدھے بند رگاہ پر تباہی۔ یہاں ڈاکٹر سلام صاحب نے دوٹکٹ لیے اور ہم نے اسٹیمر میں اپنی اپنی سیٹ سنھالی تھیں لیکن اسٹیمر کے اس سفر میں مزہ اپنی اپنی کرسی پر تباہی میں نہ تھا بلکہ جہاز کی مختلف منزلوں پر جا کر نیویارک اور نیوجرسی کو دیکھنے میں تھا۔

جہاز چلا تو ہمارے دائیں کنارے پر نیوجرسی تھا اور بائیں کنارے پر نیویارک۔ اس وقت نیوجرسی نیویارک کے مقابلے میں ایک گانو نظر آ رہا تھا لیکن بہت خوبصورت گانو جس پر نور بر سر رہا ہو۔ میں ہن جزیرے کا ساحل یعنی نیویارک کا ساحل ہمارے جہاز سے بہت قریب تھا۔ چنانچہ اب Twin Towers کو بھی قریب سے دیکھا اور اس کے علاوہ متعدد اور عمارتوں کو بھی۔ اسی Twin Towers نامی عمارت کے سائیں والی اسٹریٹ آباد ہے۔ والی اسٹریٹ نیویارک کے ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے میں ہے اور والی اسٹریٹ کا یہی وہ چھوٹا سار قبرہ ہے جس کی بد دست امریکہ نے دنیا کے مالیاتی نظام کو اپنی مشتملی میں کر رکھا ہے۔ اس چھوٹے سے رقبے میں کوئی ہوتل نہیں کوئی خرید و فروخت کی دکان نہیں۔ صرف دفاتر میں جن میں کمپیوٹروں، ٹیلی فونوں اور ٹیلیسکووں کی ایک کائنات آباد ہے۔ اب نام یاد نہیں ارہا لیکن مجھے بتایا گیا کہ اسی علاقے میں ایک عمارت ایسی ہے جس میں اکیس ہزار ٹیلی فون ہیں۔ ہاں ٹیلی فون سے یاد آیا کہ امریکہ میں ٹیلی فون کا ملنا اتنا اسان ہے کہ ہم ہندستان والوں کو اس کا یقین مشکل سے آئے گا۔ اس کے لیے آپ کو زیادہ سے زیادہ پانچ دن انتظار کرنا پڑے گا اور اگر جلد درکار ہو تو زیادہ سے زیادہ مدت دو دن ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ٹیلی فون کے لیے آپ کو کوئی فیس وغیرہ جمع نہیں کرنا پڑتی۔ روس میں تو ٹیلی فون مکان کا حصہ ہی ہوتا ہے یعنی کوئی مکان اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک اس میں ٹیلی فون نہ ہو لیکن ٹیلی فون کی بات جو امریکہ میں دیکھی وہ بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں۔

ہمارا جہاز اس وقت دریا پر ہے جس کے ساتھ روائی تھا۔ ایک مقام پر اگر دریا کا پاٹا ہے تو چورا ہو گیا۔ یہاں ایسٹ رور اس (East River)

میں اگر شامل ہو جاتا ہے اور دونوں مل کر سمندر کا جاہ و جلال دکھاتے ہوئے بھر اور قیانوس کا رُخ کرتے ہیں لیکن جس مقام پر دونوں ملتے ہیں وہاں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس چھوٹے سے جزیرے پر statue of Liberty (مجسمہ آزادی) بر سیاح اور ہر سافر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رہا ہے۔ (مجسمہ آزادی) ایک نسوائی مجسمہ ہے جس کے چہرے پر شان جمالی اور شان جلالی دونوں موجود ہیں۔ یہ مجسمہ امریکہ کی آزادی کی علامت ہے اور اس کے پیروں کو دریائے ہڈسن کی موجیں ہر وقت چومتی رہتی ہیں۔

اس جزیرے کے سامنے ہی دو اور جزیرے ہیں۔ ایک کا نام ہے گورنر ز آئی بینڈ اور دوسرے کا نام ہے برک بینڈ آئی بینڈ۔ ان کے قریب ہی Bay of New York ہے جو دریائے ہڈسن اور خراور قیانوس کو آپس میں ملاتی ہے۔

مجسمہ آزادی (Statue of Liberty) کے قریب پہنچ کر ہمارے چہارے چہارے پہنچ مورا اور ایسٹ برور (East River) میں داخل ہو گیا۔ اب ہر بہاد کی مخالف سمت کو روایت تھی اور میں ہٹن کے جزیرے کا دوسرا رُخ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ اب کے ایسا ٹرائیکٹ بلڈنگ کے علاوہ یو۔ این۔ او کی بلڈنگ مکمل صورت میں نظر آئی۔ اس کے قریب ہی ایک ہیلی پیڈ تھا جس پر ہر دو ایک منٹ کے بعد ایک ہیلی کا پڑھ اتر رہا تھا۔ یہ نظارہ بہت ہی دل کش تھا۔ اسی دریائی سفر میں راک فیلر ہونی درستی کی ایک جھلک بھی دیکھی اور کو لمبیا یوں درستی کی بھی۔

ایسٹ روے کے سفر میں ہمارا جہاز متعدد پلوں کے پیچے سے گزرا۔ ایک پُل کے اوپر کا دلکش منظر دیکھنے میں آیا۔ ایک بس ایک ریسی سے ملنی ہوئی ایک کنارے سے دورے کنارے پہنچ گئی۔ اسی اتنا میں ایرانڈ یا کا ایک طیارہ ہمارے اوپر سے گزرا اور مجھے خیال آیا کہ اسی ایرانڈ یا کا ایک طیارہ کل مجھے لے کے لندن روانہ ہو جائے گا۔

نیویارک کے آسمان پر اپ جس وقت اور جس طرف بھی نظر انہا کے دیکھیں آپ کو ایک روہوانی جہاز اڑتے نظر آئیں گے۔ ہیلی کا پڑھ بھی نظر آیں گے۔ ہیلی کا پڑھ تو خیر ذہرا کام کرتے ہیں۔ مسافروں کو ادھر سے ادھر پہنچانے کے علاوہ وہ پیچے فریفک پر بھی نظر

رکھتے ہیں۔ اگر کوئی گاڑی قانون شکنی کرتے ہوئے تیز رفتار سے جا رہی ہے تو اسی کا پڑکی رکھتے ہیں۔ اس کی اطلاع نزدیک ترین پولیس کی گاڑی یا پولیس اسٹیشن کو دے گا اور تیز رفتار گاڑی کو دھر بیجا جائے گا۔ اگر سڑک پر کوئی عادثہ ہو گیا ہے اور اس سڑک پر پرول کرتی ہوئی پولیس کی گاڑی کو اس کا پتا نہیں چل سکتا تو ہیلی کا پڑا س حادثے کی اطلاع پولیس کی گاڑی کو دے دے گا۔

ایسٹ روڈ دریاۓ ہندس نہیں سے نکلتا ہے اور اسی میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہم اسی دریا سے ہو کے پھر دریاۓ ہندس میں داخل ہوئے جہاں اس دریا کے دونوں کناروں پر شاداب گھنے جنگل دیکھو کر روح میں پالیدگی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ یہ کیفیت دو ایک میل تک رہی کیونکہ اب ہم میں ہٹن کے جزیرے کی آبادی کے قریب پہنچ رہے تھے اور جنگلوں کی جگہ بلند بالا عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

یہ تین گھنٹے کا سفر تھا جو دیڑھ بجے سے شروع ہو کے سارے چار بجے تک رہا اور اس سفر میں نیو یارک کی جو تصویر میں نظر آئی وہ شاید کسی اور طرح سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

پس فر ختم ہوا تو ڈاکٹر سلام مجھے ایک چینی ریسٹورنٹ میں لے گئے جہاں ہم نے بہت عمده چینی کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ مجھے سعد ملک صاحب کے گھر لے چلے جہاں نیو یارک میں مجھے قیام کرنا تھا۔ سعد ملک میرے عزیز دوست ہارون الرشید (رضیہ) کے داماد ہیں۔ چند ماہ قبل ہارون الرشید صاحب ہی کے دولت کدے پر پئنے میں ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی بیگم شہناز سے بھی۔ اور اب ہندستان سے ہزاروں میل دور نیو یارک میں تجدید ملاقات ہو رہی تھی۔

سعد ملک صاحب کا گھر نیو یارک کے ایک خوبصورت علاقے فلشنگ میں واقع ہے۔ فلشنگ جس ڈسٹرکٹ میں ہے اس کا نام کو یمنز ڈل ناؤن میں ہے۔ ڈل ناؤن کو جاتے ہوئے ہماری گاڑی پھر ایک ٹنل میں سے گزری۔ یہ ٹنل استراؤ کے نیچے سے گزرتی ہے۔ دریا کے نیچے سے موڑیں اور بیس بھی گزر جاتی ہیں ریلوے بھی۔ ریلوے کے لیے امریکہ میں زمین پر جگہ صنائع نہیں کی گئی۔ یا تو ریلوے زمین کے اندر چلپتی ہیں اور یا زمین سے پہنچیں تھیں فٹ اور پر تاکر ان کے نیچے زمین پر کاریں بیس اور ٹرک چل سکیں۔

کو لمبیں کے دلیں میں

سعد ملک صاحب کے گھر لو جاتے ہوئے ہم لوگ یونا سند نیشنر آر گنائزیشن کی خوبصورت اور بلند و بالا ڈسٹر نما عمارت کے سامنے سے گزر دے۔ یہاں سلام صاحب نے گاڑی روک لی اور ہم نے یو۔ این۔ او کے علاوہ جزل اسمبلی کی عمارت پر بھی ایک طائراں نظرداںی۔ اقوام متعدد کی عمارت کو دیکھتے ہوئے اپنے مر جوم روست سید محمد جعفری کا یہ شعر یاد آگیا۔

کتنا اچھا فیصلہ اس نے کیا کشمیر کا
کاغذی ہے پیر ہن ہر پیکر تصویر کا

اور میرا خیال کشمیر اور احباب کشمیر کی جانب مستقل ہو گیا اور میں نہ جانے کتنی دیر تک سیر کشمیر کے تصویر میں کم رہا۔

اب ایک تو میں تھک چکا تھا دوسرا اتنا وقت نہیں تھا کہ یو۔ این۔ او کی عمارت کے اندر جاتے ورنہ اکڑ دوستوں سے جو دہاں کام کرتے ہیں ملاقات، ہو جاتی۔ غریز محترم محمد یوسف بخش بھی وہیں کام کرتے ہیں اور جناب اخگر بخش ابادی بھی۔ ان کے علاوہ بعض اور احباب بھی وہیں مصروف کاری ہیں۔ افسوس کہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس عمارت کو دیکھ کر پیطرس بخاری بھی یاد آئے اور ن۔ م۔ راشد بھی اور کرشنا میسن بھی

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے نیم
تو نے وہ لکھ ہاے گر ان ما یہ کیا کیے

سعد ملک صاحب کے گھر پہنچتے پہنچتے سات نج کئے تھے۔ میں اگرچہ رات کو جائے کے باعث اس سیر میں کافی تھک چکا تھا لیکن یہ ایک حتفت ہے کہ سلام شاہد صاحب نے ایک دن میں نیو یارک کی جو سیر کرادی وہ میں شاید تہادس دن میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نیو یارک میں ایک بُک اسٹال پر ایک کتاب دیکھی جس کا نام ہے

The Miraculous journey of mohamed

اس کا ضمنی عنوان ہے مراجع نامہ یہ ایک مصوّر کتاب ہے اور اس میں رسول اکرم صلیم کی کوئی پیچا اس تصویر موجود ہیں۔ کتاب دیکھ کر افسوس ہوا اور اس بات کا یقین اور تذکرہ ہو گیا کہ مغربی دنیا کے بعض علقوں میں مسلمانوں کی دلازاری کا سلسلہ بند ہونے میں نہیں اور ہا ہے۔

Miraj Nāmeh

اس مصوّر کتاب کا اصل مسودہ پیرس کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔ رچرڈ پیور

نامی ایک مصنف نے اس کے فرانسیسی حصوں کا انگریزی میں (Richard Pevear)

ترجمہ کیا ہے۔ میری روز بیگوئی (Marie-Rose Seguy) نے اس کا تعارف لکھا

ہے۔ کتاب کا سن طباعت ۱۹۸۲ء ہے اور امریکہ کے ایک پبلیشور George Brazillar, Inc,

One park Avenue, New York, N.Y.10016

نے اسے موجودہ صورت میں شائع کیا ہے۔ طباعت اس کی فرانسیسی میں ہے اور جلد بندی سوئزر لینڈ میں۔ جلد کا ذست کور مغربی جرمی میں چھپا ہے۔ ایک سو انعامون صفحات کی یہ کتاب انتہائی خوبصورت اور دیز کاغذ پر چھپی ہے۔ سائز اس کا ہمارے اسٹریپڈ دیکھی کا ہے۔ جلد کی خوبصورتی اور تختیگی مرقع چھٹائی اور عمل جیغٹائی ایسی کتابوں کی جلدیں کو شرمناتی ہے لیکن کتاب اول سے آخر تک مسلمانوں کی ولازاری کا سامان یہ ہوئے ہے۔ کتاب ہر قیمت درج نہیں لیکن ہمارے حساب سے اس کی قیمت پندرہ سور و پرے سے کیا کم ہوگی۔

ناشر نے اس کتاب کے تعارف میں جلد پوش پرہ عبارت لکھی ہے:

The Miraculous Journey of Mahomet

Miraj Namah

Introduction and Commentaries

by marie Rose Seguy

The Miraj Namah is a mystical legend describing the marvelous and apocalyptic vision that marked the stages of that miraculous ascension in the course of which, one might, the founder of Islam reached the throne of God.

This sumptuous fifteenth-century manuscript of miraj, translated into eastern Turkish by the poet Mir Hyder, was calligraphed by Malik Bakhshi of Herat in the Nighur Script. It is decorated with sixty-one splendid illuminations, which bring before our eyes the successive stages of the miraculous journey of mohamet (or mohammad) first through the heavenly regions interwoven with gold and brilliant blue, peopled with angles (some with Seventy heads) whose wings are multi-coloured; and item thought the infernal world of shadows haunted by demons who torture the damned with special torments devised for every Sinner, whether he or she be a "hypocrite or a "Shameless woman" (An interesting note is that Dante's Divine Comedy may have been influenced by the miraj Namah. Since as early as 1264, there were both Facuet and Latin translations of the Moslim work available in Europe).

Marie - Rose Seguy of the Bibliotheque Nationale discusses the origin of the miraculous journey of Mahomet, ranging from the explanation of the Prophets fabulous journey and how it is portrayed in the manuscript, to the particular influences exerted on this and other Eastern Codices by the various Schools and types of Eastern art.

میری روز سیکولی کے اس تجزیے میں ایک بات بھی پہنچائی ہے اور وہ یہ کہ دانتے۔ دیورٹن کامبڈی لکھنے سے قبل مختلف مراج ناموں سے متاثر ہوا ہو گا۔ میں نے اپنے اس خیال کا اظہار "اقبال اور مغلی مفکرین" میں کیا ہے۔ اور ابھی جب کہ یہ کتاب نہیں چھپی تھی اور میں اپنے اس باب کے متعلق جس کا عنوان ہے "اقبال اور دانتے" یہ رہ کے مصنت اور محقق چاندیکر کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا تو انہوں نے میرے اس خیال سے اختلاف رائے کا اظہار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ دانتے مراج ناموں سے بے خبر رہا ہو گا۔ لیکن اب marie - Rose Seguy فرانسیسی اور لاطینی ترجمے ۱۹۴۰ء سے قبل منظر عام پر آگئے تھے بھی اپنا موقف خاصی مضبوط نیادوں پر نظر آیا بالخصوص میری روز سیکولی کے اس جملے سے کہ

----- Dante's Divine Comdey may have been influenced by Miraj Nameh

چوتھا باب

(۳۶)

امریکہ سے روانگی

رات کو تھکن کے باعث فوراً نیندا گئی۔ صحیح سات بجے آنکھوں کھلی سیکن ایسا محسوس ہوا جیسے بدن ٹوٹ رہا ہو۔ چنانچہ پھر سو گیا اور جب آنکھوں کھلی تو نونج پھکے تھے۔

شہناز اور سعد ملک کے بھائی اعجاز اپنے کام پر جا پہلے تھے۔ سعد ملک نے آج بیرے پیسے دفتر سے چھپتی لے لی تھی۔ ناشستہ کر کے اور نہاد حوکے جب میں تیار ہوا تو نیوارہ نج پھکے تھے۔ آج ہی مجھے لندن روانہ ہونا تھا اس لیے سوچا۔ نیوارک کو ایک نظر پھر دیجھ لیا جائے چنانچہ اب کے میں سعد ملک صاحب کے ہمراہ سیر کو نکلا۔ اب نیوارک کی سیر موڑ کار کے ذریعے سے شروع ہوئی۔ مہلے تو کچھ ضرورت کی اشیا خریدیں اور ایک چکر کاٹ کر گھر واپس آئے کھانا کھایا اور ریل میں پیٹھ کے ڈاؤن ٹاؤن کو روانہ ہوئے۔ امریکہ اگر ریل میں سفر کرنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ ہوا جہاز، موڑ کار اور اسیم کا سفر تو ہوا چکا تھا سیکن امریکہ کی رمل میں مشتمل کا موقع نہیں ملا تھا۔ لندن، پرس، میدرڈ اور ماسکو کی ریلوں میں سفر کرنے کے بعد اب اس بات کی خواہش تھی کہ امریکہ کی ریلوں کا بھی تجربہ ہو جائے اور ہو سکے تو بسوں کا بھی کیونکہ امریکہ کے بسوں کی میں نے بہت تعریف شنی تھی۔ گرے ماڈل بسوں کے بارے میں سُنا تھا کہ صرف ایرکنڈریشنڈ ہی نہیں ہوتیں بلکہ ان میں باقاعدہ روم بھی ہوتے

میں ۔

بہر طور آج دن بھر نیو یارک کی ریلوں میں گھومتے رہے ۔ یوں تو ان ریلوں میں کوئی خرابی نہیں بلکہ صفائی کا مجبار امر یہ کے شایان شان نہیں ۔ جس ریل میں بیٹھے اس کی دیواروں پر سُرخ، سیاہ، سبز، نیلے رنگوں میں اُٹی سیدھی لکیر میں کچھ بھی ہوئی نظر آئیں ۔ زبانِ زدہ کوں لوگ ہیں جو عوام کی ملکیت کو اس طرح نقصان پہنچاتے رہتے ہیں ۔ پلیٹ فارموں پر بھی اور پٹریوں پر بھی ردی کا غذ، خالی ڈبے اور تھوڑا بہت کوزا کرت نظر آیا ۔ یہ بات نیو یارک کی بعض سڑکوں پر بھی نظر آئی ۔ خدا جانے اس کا سبب کیا ہے ۔ شکاگو، واشننگٹن ائٹیانا یا نیو جرسی میں ایسی بات بالکل نظر نہیں آئی ۔

نیو یارک اس سیر میں تھوڑی دیر کے لیے ایمپاٹر اسٹیٹ بلڈنگ کے اندر بھی گئے اور میکینز اسٹور macy's stores

The World's Largest Stores
If you haven't seen mary's
You haven't seen New York

میں کہ نہیں سکتا کہ میکینز اسٹورز ماسکو کے گم اسٹورز سے بھی ٹراہے اور چھور اس کا بھی نہیں ہے بلکن جب میکینز والوں نے یہ بھارت لکھی ہے تو وہ سونج بھجو کے ہی لکھی ہوگی ۔ اس طرح پھر اتنے ہم کوئی چھے بجے شام تک واپس آگئے ۔

سحر قبح پوری صاحب کے ساتھ واشننگٹن سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی میکن نیو یارک آنے کے بعد ان کے ساتھ ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی ۔ ان سے ملاقات کا اشتیاق تھا چنانچہ آج دن میں آنے کے ساتھ ٹیلی فون پر بات ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ وہ چھے بجے مجھے ملنے آ رہے ہیں ۔ اس لیے بھی ہم لوگوں کا نیو یارک کی سیر سے چھے بجے تک واپس لوٹنا حرزوری تھا ۔

ہم آ کے بیٹھے ہی تھے کہ سمر صاحب تشریف لے آئے ۔ آنے کے ساتھ دو دوست بھی تھے ایک سیماں حسین صاحب اور ایک اور صاحب جن کا نام میں بھول گیا ہوں ۔ چائے کا دور چلا ۔ باتیں ہوتی رہیں ۔ شعروادب کی باتیں، شاعروں اور ادبیوں کی باتیں، مشاعروں کی باتیں ۔ اتنے یہ ساز سے سات نجع گئے پر ہونے اُٹھ بجھے ایک پورٹبل رنجھے ہبھنا تھا چنانچہ سعد ملک، شہناز

آن کے پنجھا اور اس کا چھوٹا بھائی، سمر فتح پوری صاحب، سلیمان حسین صاحب، ان کے دوست اور یہ خاکسار ایرپورٹ کو روانہ ہوئے۔ وہاں سامان بک کرایا اور دو ڈیگ جو ملے تو ان پر لکھا تھا L H R میں نے کا و نظر پڑھی ہوئی تڑکی سے کہا کہ پاکستان میں لاہور کو L H R لکھتے ہیں کہیں آپ سے غلطی تو نہیں ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ ہواں سفر میں L H R لندن کا اختصار ہے لاہور کا نہیں۔ ہواں سفر میں لاہور کا اختصار L N E ہے۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا کیونکہ گذشتہ میں جب میں کراچی سے دہلی پہنچا تو میر سامان غلطی سے دبی چلا گیا تھا۔ یہ سامان تو ہندستان میں مشعین پاکستان کے سفیر بیرون چناب عبدالستار کی مداخلت سے بحفاظت واپس مل گیا تھا لیکن میں اس کے بعد سامان کے معاملے میں زیادہ محتاط ہو گیا تھا چنانچہ اب کے ڈیگ کو نور سے پڑھا اور جب اس پر L H R لکھا ہوا نظر آیا تو اپنے بندے کا اظہار میں نے ضروری سمجھا۔

سامان بک کرتے ہی کشمیر اور امیگریشن کی منزل آئی۔ سمر صاحب اور سلیمان حسین صاحب اس منزل تک ساتھ رہتے۔ یہاں میں تھوڑی دیر اور رُک گیا کہ چند لمحے اور سمر صاحب کے ساتھ باقیں ہو جائیں۔ اسی اشنا میں سگار کی خواہش میں ملا تھا جیب تک کیا تو پتا چلا کہ سگار ختم ہو چکے ہیں۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ سگار خریدے جا سکیں حالانکہ اس وقت بھی سمر صاحب ایرپورٹ کی کسی دکان سے سگار منگوانے پر آبادہ تھے لیکن اب وقت نہیں تھا۔ لندن کے مسافروں کی قطار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ سمر صاحب نے جلدی سگریت کا پیکٹ اور لاسٹر نکال کے مجھے عنایت کیا اور میں تینوں دوستوں سے بغل گیر ہوتا ہوا کشمیر اور امیگریشن کی حدود میں داخل ہو گیا۔

ٹیارے میں اگر بیٹھے تو سازھے آٹھنچھے ڈکھ کے تھے لیکن طیارہ خاصی تاخیر سے چلا۔ دس بجے کے بعد۔ اعلان ہوا کہ لندن تک کا سفر سائز ہے پائی چھٹتے کا ہے۔ گویا نیوپارک کے وقت کے مطابق ہم لوگ حصے کے سائز ہے تین بجے لندن پہنچ جائیں گے لیکن جو نک نیوپارک اور لندن کے درمیان وقت میں سائز ہے پائی چھٹتے کا فرق ہے اور لندن نیوپارک کے مشرق میں ہے اس لیے جب ہم لندن ہنچیں گے تو دہلی دن کے نوچھے چکے ہوں گے۔

کوئی گیارہ بجے تک میں لکھنے سے فارغ ہو گیا۔ سامنے دیکھا تو فلم چل رہی تھی

پتا چلا نبھے سے چل رہی ہے۔ کھانے کے بعد اکثر لوگ روشنی بھاکر سو گئے۔ بعض فلم دیکھنے میں معروف رہے۔ میں فلم سے بے نیاز ہو کر اپنا سفر نامہ مکمل کرنے یہٹھ گیا۔ بارہ بجے فلم ختم ہو گئی۔ اب باقی ماندہ لوگ بھی بھاکر سو گئے۔ لیکن میرا سفر نامہ ابھی جل رہا تھا اور سارے بوٹنگ ہم کے میں تنہا میں تھا جو اپنی نشست کا بلب روشن کیے کاغذ اور فلم کی رفاقت میں گرم سفر تھا۔ جب سفر امریکہ کی روداد ختم ہو چکی تو میری گھر ہی میں دونوں پھلنکے تھے۔ میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ طیارے کے شیے میں سے بچے جھاناکا۔ گھپ انڈھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے صرف تصور کی نگاہوں سے دیکھا کرتے پھر اس قیا نوس ٹھاٹھیں سار رہا ہے۔ یہ وہی خرا د قیا نوس ہے جس کے بارے میں اقبال نے لکھا ہے

بخار ٹلمات میں دوڑاد بے گھوٹے ہم نے

تمہوری دیر بعد پھر گھر ہی دیکھی۔ انھی اڑھائی نہیں بجے تھے میکن گھر کے پردے سے کچھ روشنی اندر آتی دکھائی دی۔ میں نے گھر کی کاپردہ آٹھایا کیا دیکھتا ہوں کرو ہی منظر جو ذرا دیر پہلے گھٹا ٹوپ انڈھیرے کے سوا کچھ نہ کھا ٹلمات روشنی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ دس منٹ میں ایر ہو شنس نے اگر طیارے کے تمام بلب روشن کر دیے۔ میں نے کہا کیا باہر صبح ہو گئی ہے اور وہاں ابھی ڈھال بجے ہیں۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ سارے سات نج پھلنکے ہیں۔

اب باہر کے منظر کی دل کشی اور دلادیزی لفظوں کی گرفت سے باہر نکل رہی تھی۔ طیارے کا رُخ چونکہ عین مشرق کی جانب تھا اور اس کی گھر کیاں شمال اور جنوب کی جانب تھیں اس لیے میں سورج کو ٹلوع ہوتے ہوئے تو نہ دیکھ سکا میکن سطح بحر کی چمک اور طیارے کے پروں پر بلکے سبھری رنگ کی کیفیت پہ بتا رہی تھی کہ خورشید ٹلوع ہو چکا ہے اور دھوپ نے کائنات کو لباس نورہ ہنسنا شروع کر دیا ہے۔

ایک مدت کے بعد میں نے گھرے نیلے سمندر کو خواب سے بیدار ہوتا ہوا دیکھا تھا۔ اس کی سطح سے ذرا بلند کہیں کہیں ہادوں کے ٹکڑے فضا میں محوراً تھے۔ دور افق پر نصف دائرہ بناتی ہوئی روشنی کی ایک لیکھ ساری کائنات کو اپنے گھرے میں لیے ہوئے امہر رہی تھی۔ کاشش میں اس ٹلمات ماحول کو لفظوں میں مقید کر سکتا۔

میری گھر ہی جو وقت دے رہی تھی اسے میں نے لندن کے وقت کے مطابق تبدیل

نہیں کیا۔ اس میں نیویارک کا وقت بھی رہنے دیا۔ اتنے میں ایرہوسٹس ناشتہ لے آئی۔ رات کے تین بجے۔ لیکن وہ اپنے حساب سے انہی بجے ناشتہ لائی تھی۔

اب اکثر مسافر جاگ چکے تھے۔ طیارے میں ہر ہاتھور دم کے سامنے ایک ہجوم تھا۔ تمام مردوں نے دھوکر لندن کے فضائی مستقر پر اُترنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ایسی مختصر راؤں کا تجربہ ہے بھی ہو چکا تھا۔ یورپ سے نبیمی آتی ہوئے روس سے دہلی آتے ہوئے متحده عرب امارات سے دہلی آتے ہوئے۔ جمیون سے رنگوں جاتے ہوئے لیکن یہ رات تک زیادہ ہی مختصر نکلی کہ رات کے سازھے تین بجے کا وقت اچانک دن کے نوبجے میں تبدیل ہو گیا۔ کویا جو سورج نیویارک میں شام کے چھے بجے عزوب ہو گیا تھا وہ اس سفر میں رات کے سازھے تین بجے ہی طلیع ہو گیا۔

رات کو دو بنے کے بعد طیارے میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ایرکنڈینڈ نوبجے سے چل رہا تھا۔ اُدھی رات تک خاصی سردی ہو گئی تھی۔ میں کمبل اوڑھ کے بیٹھ گیا اور مجھے ان مسافروں پر رشک آئے لگا جو ابھی تک بھی تان کے سورہ ہے تھے۔ نیند بھی کیا ظالم شے ہے۔ اس وقت اپنا ایک پُر ناشر پیدا ہوا۔

گر ز آئے بستر سنجاب پر آتی نہیں
اور اگر آئے تو کاثشوں پر بھی آجائی ہے نیند

(۳۷)

پھر لندن میں

کوئی نوبجے طیارہ لندن کے فضائی مستقر پر اُترا۔ اُسی ہتھر د کے فضائی مستقر پر جہاں میں کوئی ایک ماہ قبل تین گھنٹے کے لیے رکا تھا۔ باہر آیا تو سبھا ش میرے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ گھر کو ردہ ہوا۔ مہلے وہ اکبرجن روڈ پر واقع اپنی ڈکان گیریبل میں لے گئے۔

اُن کا کار و بار دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ وہاں سے ہم لوگ گھر گئے اور وہ دن میں نے آرام کرنے میں گزارا۔ ایک آدھ لگھتے کے بیچے سویا بھی بیکن ساری رات جا گئے سے جو تھکن جو گئی تھی وہ ایک آدھ لگھتے سونے سے جانے سکی۔ جا گا تو پنا چلا بعض دوستوں کے میلی فون آئے تھے۔ ابھی میں جواب میں میلی فون کرنے کا خیال ہی کر رہا تھا کہ نیلی فون کی لگھتی بھی۔ یہ اطہر راز کا نیلی فون تھا۔ اطہر راز سے میری خطا و کتابت رہی تھی اور اُن سے ملنے کا مجھے اشتیاق تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ شریف لا میں تاکہ گھر ہی پر شام اُن کے ساتھ سبھا ہو سکن انہوں نے پتا بتاتے ہوئے کہا کہ یہاں الجمن ترقی اردو برطانیہ کی طرف سے ہم نے ایک نشست کا انتظام کیا ہے۔ پندرہ بیس اجباب جمع ہیں۔ آپ ہی یہاں آئیں۔ اس وقت رات کی تھکن کے باعث جسم چور چور ہو رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس وقت گھر میں پھوٹ کے ساتھ باتیں کروں۔ اور امریکہ میں مسلسل دعوییں کھانے کے بعد ایک دن گھر میں سادہ کھانا کھاؤں۔ راج، نیلم، کرن، مالتی، اجیت سب گھر آ جائے تھے میں اطہر راز نے کچھ اس طرح احرار کیا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ عزیزم سُبھاش کی رہنمائی میں اُن کے بتائے ہوئے پتے پڑا ہمپیا۔ سُبھاش کے ہم زلف ستون ترجمہ میں وہ اپنے بیٹے کی طرح عزیز مرد لگتے ہیں ساتھ تھے۔

صاحبِ فانہ نے کھانے اور نشست دونوں کا بہت عمدہ انتظام کیا تھا۔ اکثر صاحبِ فانہ نے کھانے اور نشست دونوں کا بہت عمدہ انتظام کیا تھا۔ اکثر احباب سے وہاں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ پُر اُنے رفیقوں میں سید محمد تقی سابق مدیر جنگ، اور جناب اَصف جیلانی "مدیر جنگ" لندن موجود تھے۔ محمد تقی صاحب نے اپنے یورپ اور امریکہ کے سفر کی کہانی مُناسی۔ فلاسفی کانگرس میں شرکت کی روداں بھی تفصیل سے بیان کی۔ میں اُن کے افکار سے بُڑی حد تک مستفید ہوا۔

اس محفل میں شعر اک خاصی تعداد تھی۔ سب کا کلام پسند آیا۔ اطہر راز کی نظم "سفر اپنی ذات کے اندر" تو میں نے درخواست کر کے لیتی۔ یہ نظم میں پہلے پڑھ چکا تھا۔ اس نے قدرِ مکار کا لطف دیا۔

آنھتے وقت میں نے اطہر راز سے گزارش کی کہ اس محفل میں شرکیک تمام دوستوں کے نام وہ مجھے دے دیں تاکہ میں اپنے سفر نامے میں ان کا ذکر کر سکوں اُنہوں نے وعدہ کیا میکن ابھی تک وہ نام مجھے موصول نہیں ہو سکے اور میں شرمende ہوں کہ صاحبِ خانہ

اور ان کی بیگم صاحبہ کا نام بھی مجھے یاد نہیں رہا۔ جنہوں نے اپنے دولت کد سپر اتنی عمدہ دعوت اور نشست کا استظام کیا تھا۔

بھاش کا گھر ہنگڈن میں ہے۔ ایرپورٹ سے جب وہ مجھے اپنی دکان پر اور پھر گھر کی طرف لے کر بھلے تو اپنگ کا من، اپنگ براؤ نے اور ایشن کے علاقے رستے میں آئے۔ میں ایک مدت کے بعد ان علاقوں میں سے گزر رہا تھا۔ اکثر جگہوں کو ہرچنان بھی رہا تھا اور یہ تمام علاقے یادوں کی ایک کائنات میرے اندر بیدار رہے تھے۔

میں نے سوچا تھا ایک دن آرام کے بعد سارے لندن میں سیر کا پروگرام بنادیں گا اور سال باسال پڑائی یادیں تازہ کروں گا۔ یہ برش میوزیم ہے، یہ نیشنل گیلری ہے، یہ ٹریٹ گیلری ہے، یہ لندن یونیورسٹی ہے، یہ اردو کا شعبہ ہے جہاں ریلف رسائل پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ بیلباسی ہے، یہ سینٹ جیمز پارک ہے اور لندن سے ذرا دور پر اکسفورڈ ہے، یہ کمپرج ہے۔ اندر وہ شہر ہیں یہ پکیڈل ہے اور یہ سوہو کا علاقہ ہے جو اس وقت جاگتا ہے جب سارا لندن گھری نیند میں سوتا ہے۔ لیکن سارے لندن کی سیر کے لیے تو کسی ماہ درکار ہیں اور اپنے پاس بہاں قیام کے لیے پورا ایک ہفتہ بھی نہیں تھا۔

(۳۸۱)

زہرہ نگاہ

چند ماہ قبل دہلی کے اند و پاکستان مشاعرے میں جو ہر سال شنکر شاد میہوریل لٹری ٹرسٹ کے زیر انتظام منعقد ہوتا ہے میں نے زہرہ نگاہ سے کہا تھا کہ شاید اس برس آپ کے ساتھ لندن میں ملاقات ہو۔ انہوں نے پتا اور میلی فون نمبر مجھے دے دیا تھا۔ امریکہ پہنچ کے میں نے انھیں خط لکھا تھا کہ واپسی پر لندن میں قیام کروں گا اور آپ

سے اور ماجد صاحب سے ملوں گا۔ جواب میں ان کا ٹیکلی فون ڈاکٹر خورشید ملک کے دونت کدے پر آیا تھا جس کی اطلاع مجھے اُسی دن رات کو گھر واپس آنے پر ملی تھی۔ لیکن اس وقت شکا گو بس رات کے دس بجے تھے کو یا ندن میں رات کے ریاضی کے، تین بجے ہوں گے۔ اس لیے میں نے سوچا یہ وقت ٹیکلی فون کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اور پھر ایسی مھرووفیت رہی کہ ندن پہنچنے تک اُنھیں ٹیکلی فون نہ کر سکا۔

اس لیے آج صحیح جاگا تو زہرہ بہن کو فون کیا۔ وہ گھر پر نہیں تھیں۔ ماجد صاحب تشریف فرماتھے۔ ان سے پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے ٹیکلی فون سے اُنھیں دلی مسرت ہو رہی ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ دو دن بعد یعنی ۲۴ کو زہرہ کو باجی چارہ ہی ہیں اور مجھ سے اُنھوں نے کہا کہ کل رات آپ ہمارے یہاں کھانے پر آئے۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

پکھو دیر گزری تھی کہ زہرہ بہن کا فون آیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آج رات کو کوئی اور پروگرام نہ ہو تو آپ آج رات ہی کھانے پر آئے۔ یہ تجویز میرے لیے زیادہ پسندیدہ تھی چنانچہ اُسی شام ہی کو زہرہ بہن کے دل میں جانے کا پروگرام طے ہو گیا۔ اُنھوں نے ساتھ ہی یہ تردہ بھی سنایا کہ مشتاقِ احمد یوسفی بھی تشریف لا رہے ہیں۔

اس کے بعد آل حسن سے ٹیکلی فون پر بات ہوئی۔ وہ ایک آدھ دن میں بن بنی۔ سی سے ریسا رہ رہے تھے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کیونکہ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ ریسا رہنے سے عمر کو پہنچ لے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب خستہ کے بغیر کوئی سے کام بند ہیں۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ بن بنی۔ سی کو آل حسن کا بدل شاید ہی مل سکے۔ آل حسن کے ساتھ ۲۸ ستمبر کا دن ملاقات کے لیے طے ہوا۔

خلیل الدین عالی سے ٹیکلی فون پر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ آج وہ بھی فون پر مسل کئے۔ اُنھوں نے بتایا کہ ۲۳ کو گلاسکو میں شاعر ہے۔ قتیل نے اس کا انتظام کیا ہے مجھ سے اُنھوں نے کہا کہ تم بھی چلو۔ جی تو میرا چاہا کہ گلاسکو جاؤں قتیل سے ملوں۔ جمیل الدین عالی کے ساتھ ہمسفری ہو لیکن ۲۳ کو چونکہ بیٹی سے ملنے فرودشم جانا تھا اس لیے گلاسکو کا پروگرام ترک کرنا پڑا۔

آج فرودشم (چیشیر) میں پر ملا کے ساتھ ٹیکلی فون پر بات ہوئی اپنے داماد

ڈینس کے ساتھ بھی اور زمکون کے ساتھ بھی۔ میری نواسی گیتا جو پچپن میں دہلی میں رہی اور وہیں اس نے اپنی تو تملی زبان میں بات کرنا سیکھا اب ہندستانی بالکل بھول، چلکی ہے اس کا چھوٹا بھائی نیل تو خیر ہندستان میں رہا ہی نہیں اس لیے اُس کے توارد و یا ہندی میں بات کرنے کا کیا سوال۔ سارے فروڈ شم میں پر ملا واحد ہندستانی لڑکی ہے اور اگرچہ یہ اردو، ہندی اور بُنجابی جانتی ہے لیکن یہاں ان زبانوں کا کیا مصروف ہے یہاں انگریزی کے سوا اور کوئی زبان کام میں نہیں آسکتی۔ اس لڑکی نے بڑے شوق سے اردو پڑھی تھی لیکن اس کے ساتھ اردو میں کوئی بات کرنے والا نہیں۔ ڈینس، پر ملا اور گیتا تینوں رینکورن میں کام کرتے ہیں۔ دماس بھی غائب اور کوئی ہندستانی نہیں ہے۔ کویا پر ملا کو بھی یہاں آنے کے بعد کبھی اپنی زبان میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

پر ملا کا معاملہ توضیریہ ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول میں ہے جہاں اردو، ہندی بُنجابی میں بات کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ امریکہ، یونیڈ ایورپ اور انگلستان کے ان علاقوں میں جہاں ہندستانی اور پاکستانی خاصی تعداد میں آباد ہیں اور اپنے اپنے کلچر، زبان اور روایات کے تحفظ کے لیے کوشا ہیں آنے والی نسلوں کے مستقبل کی کیا صفائحہ ہے؟ اپنے ملک کو چھوڑ کر باہر جانے میں تو کوئی قباحت نہیں اور کہ میں گے اہل نظر نازہ بستیاں آباد، بھی ایک حقیقت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مستقبل میں ان بستیوں کے شخص کی پہچان باقی رہ سکے گی؟ اور اگر نہ رہ سکی تو مفسر حیات ان ملکوں میں اکر رہ پیا کمانے کی سوا اور کچھ باقی رہ جائے گا؟

پر ملا کو جب میں نے بتایا کہ میں پر سو صبح یعنی ۲۶ ستمبر کو تمہارے یہاں فروڈ شم پہنچ رہا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی لیکن اس بات سے وہ افسردا ہو گئی کہ میں دوسرے ہی دن یعنی ۲۷ کو دماس سے لندن واپس اکر رہنے کا ہو جاؤں گا۔ پر ملا نے کہا کہ ۲۵ میں کی شام کو لندن ہی آجائے گی اور ۲۶ میں صبح مجھے اپنے ساتھ فروڈ شم لے جائے گی۔

شام کو بھاشش اور میں باہر نکلے۔ انہوں نے اپنے بعض دوستوں سے ملوایا اور کوئی ساڑھے سات بجے تک ہم لوگ زہرہ بہن کے یہاں جا پہنچے۔ ماجد صاحب سے ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ بڑے نیپاک سے ملے۔ ان کا ذکر خیر میں علی گڑھ سے کراچی ملک اور کراچی سے ابوظہبی تک کئی چلکوں پر سُن پکھا تھا اور ان کے رچے ہوئے شوی ذوق کے متعلق

بھی اچاب بہت کچھ بتا سکتے تھے۔ لیکن اب جو ان کے ساتھ چار پانچ گھنٹے کی محفل جب تا پہلی بار ان کے تبریز علمی کا پتا مجھ کو چلا اور ان سے ملاقات کی پہلوؤں سے میرے علم میں اضافے کا باعث ہوئی۔

مجھے اور بھاش کو دماغ پہنچنے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ سید عاشور کاظمی اور افتخار عارف کے بعد مشتاق احمد یوسفی اور ساقی فاروقی تشریف لائے۔ مشتاق احمد یوسفی، ساقی فاروقی اور افتخار عارف سے بھی ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ ان سے ملنے کا مجھے اشتیاق تھا۔ ان سے غائبانہ تعارف ایک زمانے سے تھا لیکن سید عاشور کاظمی کے نام سے میں پہلی بار آشننا ہوا تھا۔ با توں کے دوران ... جب شعرو شاعری کا دور چلا تو افتخار عارف نے سب سے پہلے اپنا کلام سنایا۔ ان کا کلام تازگ اور شکفتگ سے برباد تھا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ انھیں صحیح کو پاکستان روانہ ہونا تھا۔ وہ بہت کم بیٹھے۔ کھانے میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ ان کی اور شعری تخلیقات سننے کی خواہش دل میں رہ گئی۔

زہرا بہن نے کھانے میں بہت اہتمام کیا تھا۔ ایک غیر رسمی ملاقات کو دعوت میں تبدیل کر دیا۔ کھانے کی میز پر مشتاق احمد یوسفی کی شکفتہ بات چیت اور لطائف نے محفل کو زعفران زار بنادیا۔ ساقی فاروقی کا کلام "سب خون" میں اکثر نظر سے گزرا تھا۔ اب ان کی زبانی سننے کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ چودھری نعیم آج لندن میں ہیں اور کل شکاگو روڈ ہو رہے ہیں۔ چودھری نعیم کا اور میرا معا ملہ بھی عجیب رہا۔ وہ دہلی پہنچنے اور میں دہلی سے چلا۔ جب تک میں امریکہ بلکہ شکاگو میں رہا وہ ہندستان میں رہے اور میں امریکہ سے لندن پہنچا تو وہ لندن سے امریکہ روانہ ہو گئے۔

آج بات چیت کا علمی معیار بہت بلند رہا اور اس کا سبب ماجد علی، مشتاق احمد یوسفی اور ساقی فاروقی کی موجودگی تھی۔ اقبال اور غالب کی فارسی شاعری کا ذکر خاص طور سے جان محفل رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر حرمت انگریز مستر ہوئی کہ زہرا بہن کو غالب کا خاص فارسی کلام یاد ہے اور اردو شاعری کے ساتھ ہی ساتھ فارسی شاعری پر ان کی کہری نظر ہے۔ زہرا نگاہ سے ملاقاتا تیس تو ۱۹۳۸ء سے ہو رہی تھیں لیکن فارسی شاعری کے ساتھ ان کے اس لگاؤ کا علم مجھے آج پہلی بار ہوا۔ ان کے ساتھ بات چیت

یہ ایک اور انکشاف بھی ہوا کہ عنقریب زہرہ نہن کے مقالات کا ایک مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

کوئی سائز سے بارہ بجے کے قریب یہ محفوظ اختتام پذیر ہوئی لیکن اس کے باوجود یہ ایک تشنگی کا احساس لے کر دہائی سے اٹھا۔ گھر پہنچنے تو ایک نجی چکا تھا۔

(۳۹)

حیدر آباد ایسوی ایشن

آج صبح گھر سے نکلتے ہی "ہندستان ٹائمز" کے دفتر کا رخ کیا۔ میرے ہزار دوست رکھشت پوری یہاں "ہندستان ٹائمز" کے نمایندے ہیں۔ نمایندے کے معنی یہ ہیں کہ اس دفتر کے ہر طرح سے انجارج ہیں۔ لندن اگر ان سے نہ ملنے کے معنی یہ تھے کہ میں لندن آیا، ہی نہیں ہوں۔ سوتنتر میرے ساتھ تھے اور دن بھر میری رہنمائی کا کام ان ہی کے پرد رہا۔ چند قدم پر زمین دوز ریل کا اسٹیشن تھا۔ متادت کے بعد لندن کی زمین دوز ریل میں بیٹھنے کا موقع مل رہا تھا۔ ریل میں بیٹھنے اور فلیٹ اسٹریٹ جات پہنچنے۔ گذشتہ سفر میں جب میں یہاں تھا تو فلیٹ اسٹریٹ میں "ہندستان ٹائمز" کی اپنی عمارت تھی "ہندستان ٹائمز ماؤس"؛ اب یہ عمارت فروخت ہو چکی ہے اور "ہندستان ٹائمز" کا دفتر انٹرنیشنل پر میں سفر کے ایک حصے میں ہے۔

یہاں بہت دیر رکھشت پوری سے باتیں رہیں۔ انہوں نے اپنی خی سکر ٹیکری سے ملوایا اور بتایا کہ آج ہی انہوں نے یہاں کام شروع کیا ہے۔ مزید تعارف کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان کا تعلق اسپین سے ہے اور یہ بات ان کی غزالی انکھوں سے ظاہر تھی ت

آج بھی اس دلیں میں عام ہے چشم غزال

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل اشیں

نام ان کا یاد نہیں رہا۔ خوبصورت چہرہ اور خدود خال نظر کے سامنے ہیں۔ رکھشت پوری کے دفتر سے دو اپک بار "جنگ" کے مدبر اصف جیلانی صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ نہ ملے۔ اب دونج رہے تھے۔ رکھشت مجھے اور سوتزر کو بل۔ بل سی کے ریسٹورنٹ میں لے آئے۔ وہاں ہم نے کھانا کھایا جس کے بعد رکھشت تو اپنے دفتر کو واپس پھلے گئے اور ہم بوگور نے کھر کارڈخ کیا۔

بل۔ بل سی کے ریسٹورنٹ نے کسی پرانی یادوں کو تازہ کر دیا۔ کسی دوست احباب یاد آئے۔ عاشق حسین بٹالوی، اقبال سنگھ، بلونٹ پوری لیکن اس سفریں معاملہ بھائیں بھائی کا تھا۔ سب سے ملنے کی حرمت دل میں رہ گئی۔

آج رات کا کھانا افتخار صدیقی صاحب کے بہار تھا۔ برادر محترم متظور مصطفیٰ صدیقی اس وقت تک لندن پہنچ چکے تھے۔ افتخار صاحب کے ساتھ ملاقات ایک مرتب کے بعد ہو رہی تھی۔

شام کو میری بیٹی اور داماد فردش شم سے لندن آ رہے تھے۔ مجھے فرڈ شم لے جانے کے لیے۔ چنانچہ میں، بھاشش اور سوتزر بوسٹن کے ریلوے اسٹیشن پر ہنپھے اور انھیں لے کے افتخار صاحب کے دولت کرے پر آئے۔ وہاں سیدہ نہن، شامانہ نیٹی اور دوسرے اعزاز سے ملاقات ہوئی۔ ویس یہ پتا چلا کہ لندن میں ایک حیدر آباد ایسوسی ایشن قائم ہے جس کے زیر اہتمام اکثر جلسے، مشاورے ہلاتے رہتے ہیں اور اس ایسوسی ایشن کی طرف سے ہر سال ایک مجلہ بھی شائع ہوتا ہے۔

یہ غفل بانگل اپنے گھر کی محفل تھی اور ان مخلفوں کا ایک تسلیل تھا جو حیدر آباد میں برادرم ارشاد صدیقی کے مکان پر منعقد ہوتی رہتی ہیں اور یہ میں جن میں ۱۹۵۶ء سے شرپک ہوتا چلا آیا ہوں۔

رات کو گھر واپس ہنپھے تو پتا چلا کہ بی۔ بی۔ سی کے پاکستان سیکیشن سے وقار احمد صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو گئی تھی اور اس وقت انھیں ٹیلی فون کرنا مناسب نہیں تھا۔

وقار احمد صاحب کے کوئی ایک برس ہوا جوں میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اسی لندن سے وہاں گئے ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے سے بی۔ بی۔ سی کے لیے انڑو لو لیا تھا۔

بہ انٹر دیوجب لندن سے نشر ہوا تھا تو میں تو نہیں سن پایا تھا لیکن میرے اگر دوستوں نے سننا تھا اور مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ بہاں اگر جب ان کے ٹیلی فون کی اطلاع ملی تو مسرت ہوئی۔

(۰۴)

فروڈ شم

آنچھے میں فروڈ شم آنے کی نیاری کر رہا تھا کہ وقار صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ ان کی آواز سنی تو جوں کی ملاقات پھر سے یاد آگئی۔ انہوں نے پروگرام پوچھا۔ میں نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں فروڈ شم جاری ہاں۔ کل شام تک واپس آجائوں گا۔ ۲۸ کا دن لندن میں رہوں گا اور ۲۹ کی صبح کو پہنچستان روانہ ہو جاؤں گا۔

انہوں نے ۲۸ ہی کے لیے پاکستان سیکیشن میں ریکارڈنگ کی دعوت دی اور ساتھ ہی بتایا کہ برمنگھم ٹیلی ویژن سے آپ کے لیے ٹیلی فون آیا ہے۔ وہ جمع کے روز آپ کو برمنگھم آنے اور ریکارڈ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں نے مجبوری ظاہر کر کہ جمعہ نیک تو قیام مشکل ہے۔ میں تو منگل ہی کو واپس جاری ہاں۔ بہر طور ۲۸ کے لیے پاکستان سیکیشن کی دعوت میں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ انڈھن سیکیشن میں بھی ریکارڈنگ ۲۸ کے لیے طے ہو چکی تھی۔

اس دوران میں غاباً وقار احمد صاحب نے برمنگھم ٹیلی ویژن کے ساتھ توبات کر لی اور میری مجبوری آن تک ہنسنا دی۔ تھوڑی دیر میں برمنگھم سے سڑگوڑہ کا ٹیلی فون آیا اور اس تعارف کے بعد کہ وہ آں انڈیا ریڈیو میں کام کر رہے ہیں اور میری دہلی میں آن کے ساتھ ملاقاتیں ہو چکی ہیں یہ فرمایا کہ انہوں نے میرے لیے ندن ٹیلی ویژن کا استذرا و بُک کر لیا ہے اور وہ ۲۸ ہی کو یعنی میری واپسی سے قبل لندن آگر برمنگھم ٹیلی ویژن کے

پیے ریکارڈ نگ کر پیس گے۔

گوئڈ صاحب نے میرے پیے اتنی زحمت کی تھی کہ جو پروگرام جمعے کے روز ہونا تھا اس کی تاریخ چار دن پہلے مقرر کر دی اور وہ بھی برمنگھم کے عوض لندن میں چنا چکھ میں نے ان کی دعوت بخوبی قبول کی اور ۲۸ ستمبر کے پروگرام میں ٹیلی ویژن کی ریکارڈ نگ بھی شامل ہو گئی۔

منگل یعنی ۲۸ ستمبر کا پروگرام اب بڑھتا جا رہا تھا اور ۲۹ ستمبر کی صبح کو مجھے واپس روانہ ہونا تھا۔ دو پروگرام ریڈیو کے اور ایک ٹیلی ویژن کا پہلے تینوں منگل ہی کو ریکارڈ ہونا تھے۔ اصف جیلانی صاحب سے ملنے کا پروگرام بھی آج ہی تھا: جمیل الدین عالی سے بھی یہ طے ہوا تھا کہ ۲۸ کی شام کو بی۔ بل۔ سی میں ملاقات ہوگی۔ اور آج فردا شم سے روانگی سے قبل سو ہن راہی صاحب کا بھی ٹیلی فون آیا تھا کہ وہ ۲۸ کو اس خاکسار کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ اُن سے بھی میں نے ہمی کہا کہ ۲۸ کو بارہ بجے کے قریب آل حسن صاحب سے ملنے میں بی۔ بل۔ سی اور ہا ہوں۔ آپ سے بھی ملوں گا۔ جلے کا وقت ہو یا نہ ہو ملاقات تو ہونا چاہیے۔

اسی طرح ٹیلی فون کرتے کرتے ہم لوگ کوئی بارہ بجے گھر سے نکلے۔ بھاشش ہی اپنی گاڑی میں لے کر ہمیں چلے۔ راستے میں بھاشش ڈکان پر اُتر گئے اور سوتھرے میں اُسی گاڑی میں یوشن کے روپے اسٹیشن پر چکھا دیا۔ ریل کے وقت کے بارے میں ہمیں کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ ریل پونے دو بجے چلی اور ڈھائی گھنٹے میں ڈھائی سو میل کا فاصلہ طے کر کے رنکارن پہنچ گئی۔ فردا شم رنکارن سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ میں میل کے فاصلے پر بول پوں ہے اور ریل وہاں ختم ہو جاتی ہے۔

آج صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ ریل چلی تو لندن کے مضافات کا نقشانظر میں تھا۔ یہ مضافات خُن و نفاست میں ویسے ہی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور بوندا باندی میں تو ان کے خُن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ دھنڈ جب ہستی تھی تو دور دور تک ہرے بھرے کھیت اور سربرا شجر اپنی بہار دکھاتے نظر آتے تھے۔ یہ منظر ہمازی منزل مقصود رنکارن تک رہا۔

کل ڈین میں اپنی گاڑی اسٹیشن پر چھوڑ کے لندن روانہ ہو گئے تھے۔ وہ غلطی سے

گاڑی کے یہ پھر جلتے چھوڑ آئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہم لوگ رنجارن پہنچنے تو گاڑی کی سیڑی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ڈینس نے گھر تسلی فون کیا۔ میری نواسی گیتا اپنی گاڑی لے کے آنکھی اور ہم لوگ دماس سے گھر پہنچنے۔

فروڈ شم ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اس کا اپنا ریلوے اسٹیشن ہے میکن۔ یہاں پہنچنے کے ریل کی بجائے اپنی گاڑی سے گھر آنا زیادہ آسان تھا۔ یہاں صفائی کا معیار بہت بلند نظر آیا۔ سارا شہر دھلا دھلا یا دکھائی دے رہا تھا۔ کسی شرک پر کاغذ کا ایک ٹھڑا پڑا ہوا نظر نہ آیا۔ ویسے صفائی کا معیار سارے امریکہ، سارے یورپ اور سارے انحصارستان میں لا جواب ہے۔ صرف نیو یارک میں گندگی نظر آئی اور کسی حد تک لندن میں بھی۔ باقی تمام شہر اور قصبے انتہائی صاف سُنخڑے اور کوڑا کر کر سے پاک دکھائی دیے۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی بارش کا سلسلہ چاری رہا اس لیے کہیں نیز کے پیے نکلنے لے کار نظر آیا۔ گھر ہی میں گپٹ شپ میں وقت گزر گیا۔

شام کو ٹیلی ویژن پر باب ہوپ کا پروردگرام آ رہا تھا۔ بہت عمدہ تھا۔ اس کے بعد ایک امریکی فلم Gambler شروع ہوئی۔ کوئی نوبتے کے قریب ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ ایک آدھ کھنڈ پھر گپٹ شپ رہی اور گیارہ بجے کے قریب میں اپنے کرے میں آکے سو گیا۔

(۱۱)

لندن کو واپسی

صحیح کو جاگا تو معلوم ہوا کہ برمنگھم ٹیلی ویژن سے ہر اتوار کو اردو پر وگرام ٹیلی کاست ہوتا ہے۔ یہ دہی پر وگرام ہے جس کے لیے مجھے برمنگھم ٹیلی ویژن نے دعوت دی ہے۔ آج اتوار تھا۔ برمنگھم چینیل پر ٹیلی ویژن کو کھولا تو سندھستان ہی کے متعلق پر وگرام اور رہا تھا۔ بھارتی

کو لمبیں کے دل میں

و دیا بھون لندن میں لارڈ ماونٹ بیٹن کے نام ایک ہال کا اضافہ کیا گیا تھا اور اس ہال کا افتتاح برطانیہ کی وزیر اعظم منیر تھا جس نے کیا۔ بعض ہندستانی یہود بھی اس وقت موجود تھے۔

اس کے بعد اردو بردگرام آیا۔ صہندر کوں، قتیل شفافی سے انڑویوں رہے تھے۔ قتیل کے ساتھ اس پک طرف ملاقات سے دل خوش ہو گیا۔ دراصل قتیل کے ساتھ دو روز قبل کلا سکو میں ملاقات کی ایک صورت پیدا ہوئی تھی۔ جس دن میں لندن پہنچا تھا اُس دن ٹیلی فون پر میں نے جمیل الدین عالی کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ۶۴ کو کلا سکو میں مشاعرہ ہے۔ اس کا انتظام قتیل نے کیا ہے۔ لندن سے کلا سکو پایا گئے کا سفر ہے۔ دونوں ساتھ چلیں گے مزہ رہے گا۔ میراجی تو چاہا کہ لندن سے کلا سکو کا سفر جمیل الدین عالی کے ساتھ ہمسفری کا طف انہاؤں اور کلا سکو جا کر قتیل سے ملاقات کروں لیکن فرودگم سیس ٹیلی سے ملنے جانا ضروری تھا۔ اس یہے مشاعرے میں شرکت کا ارادہ ملتوی کیا اور اب جو ٹیلی کے گھر میں ٹیلی ویژن پر قتیل کو باتیں کرتے اور کلام پڑھتے دیکھا تو ایسا شخص سر بوا جسے کلا سکو نہ جانے کی کسی حد تک تلافی ہو گئی ہے۔

اسی اثناء میں میرے نواسے نیل کا ایک دوست ناجمل اس سے ملنے کے لیے آیا۔ نیل اور ناجمل دونوں ہم عمر ہیں کوئی آٹھہ آٹھہ برس دونوں کی عمر ہو گی۔ ہم لوگوں نے کھانا شروع کیا تو ناجمل اور پر جا کر نیل کے کرے میں بیٹھ گیا۔ میں اسے بلانے کے لیے گیا کہ اُو بھارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ وہ چیپا ہوا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھانے کے لیے کہا تو انتہائی معصوم بیٹھے میں بولا No, I am shy مجھے اس کے اس مخصوص جواب پر بہت پیارا یا اور اسے کھانے میں شریک ہونے کی ترغیب دی لیکن وہ شر میلانچہ منجھ چیپا ہے نیل کے بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔

آج بھی دن بھر لونداباندی ہوتی رہی اس یہے نیر کی خاطر باہر نکلنے کا پر بردگرام نہ بن سکا۔ گھر ہی پر رہے۔ ڈنپس اس دران میں زکارن کے روپے اشیش پر جا کر اپنی کاڑی واپس لے آئے تھے۔

آج چونکہ اوار تھا اس یہے بچے بھی گھر ہی پر رہے۔ میری روانگی سے ذرا قبل گستاخ ایک سہیلی بیک اُس کی عمر کی اس سے ملنے کے لیے آئی۔ یہ بڑی بھی ناجمل کی طرح خاصی شرمیلی تھی۔ ہندستان کی طرح یہاں بھی چھوٹے شہروں کی روکیاں بڑے شہروں

کو لمبیں کے دیس میں

کی رذیکوں کے مقابلے میں شر میلی جوتی ہیں۔

اس وقت تک سر پہر کے تین بجے چلکے تھے۔ چار بجے میری ریل کا وقت تھا۔ ڈنیس پر ملا۔ گستاخ اور بیک مجھے پہنچانے کے لیے آئے۔ رنکارن اسٹیشن پر اکرہمیں معلوم ہوا کہ جس ریل سے مجھے لندن جانا ہے وہ اپنے اوقات کے مطابق لور پور سے چل کے لندن تو اپنے وقت پر پہنچ گی لیکن رنکارن سے نہیں گزرے گی۔ اگر اس ریل سے سفر کرنا ہو تو بہاں سے بیس منٹ کے فاصلے پر وازنگٹن نامی اسٹیشن سے اس میں سفر کرنا ہو گا۔ یہ چونکہ تیز ریل گاڑی تھی اس لیے مجھے ایسی میں سفر کرنا تھا۔ وازنگٹن تک جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر بیوے کی بس موجود تھی جس کے با رسے میں ہمیں بتا پا گیا کہ بغیر کرایہ لیے مسافروں کو رنکارن سے وازنگٹن تک پہنچائے گی لیکن چونکہ ہم سب ڈنیس کی گاڑی میں تھے اس لیے گاڑی میں وازنگٹن تک کئے۔

آج سردی زیادہ تھی اس لیے وینگ روم میں ہیتر جل رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ریل آگئی اور میں سب سے رُخت ہو کر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ انہوں سے رُخت ہوتے وقت دل بھرا آیا اور حب تک ریل لندن نہ پہنچ گئی طبیعت اور اس رہی اگرچہ راستے میں حسین اور دل کش مناظر کی نہیں تھی۔ صد نگاہ نک پہنچیے ہوئے سبزہ زار اور ہرے بھرے اشجار کشمیر کی تو نہیں لیکن بتوت اور رام بن کی یاد ضرور دلار ہے تھے۔

شام کو ریل یوستن پہنچی تو سہماش اور مستوائزہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ گھر پہنچا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ سوہن را ہی صاحب کا ٹیلی فون آپا۔ انہوں نے کہا کہ قتیل صاحب گلاس گو سے آپ کے متعلق کسی بار نیلی فون کرنے کے پس اور وہ آپ کے ٹیلی فون کے منتظر ہیں۔ میں نے وہاں ٹیلی فون کیا لیکن قتیل صاحب اس س وقت لگھ پر نہیں تھے۔

ساتھ بھی سوہن را ہی صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ کھل بی بی۔ سس میں جہاں مجھے ریکارڈ کے لیے پہنچا ہے میرے منتظر ہوں گے۔

(۲۱)

بی۔ بی۔ سی لندن اور برمنگھم میلی دیڑن

آنچ چونکہ دو پر دگرام بی۔ بی۔ سی لندن (ریڈنڈیو) کے لیے ریکارڈ کرنا تھے اور ایک برمنگھم میلی دیڑن کے لیے اس پیسے دس بجے تک تیار ہو گیا۔ اسی وقت وقار صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے ریکارڈنگ کے بارے میں یاد دلایا۔ میں نے کہا میں تیار ہوں اور آپ ہی کی طرف آ رہا ہوں۔ چنانچہ سوتھر جی کو ساتھ لیا اور بی۔ بی۔ سی بیسنٹ ماؤنٹ اس کی طرف روانہ ہو گیا۔ وقار احمد صاحب بیرے منتظر تھے۔ بڑے پیاک سے ملے۔ اپنے جمبو و کشیر کے سفری داستان سناتے رہے۔ تھوڑی دیر میں آل حسن بھی آگئے۔ ان سے بھی ملاقات مدت کے بعد ہو رہی تھی۔ دیر تک باتیں رہیں۔

وقار احمد مجھے اور سوتھر جی کو بی۔ سی کلب میں لے گئے۔ تھوڑی دیر میں آل حسن بھی دہیں آگئے۔ دہاں سے فارغ ہوئے تو وقار صاحب نے اسٹڈیو میں لے جا کر کوئی پندرہ منٹ کا انٹر ویو ریکارڈ کیا۔ پندرہ منٹ میں انھوں نے کئی مسائل کو چھیڑا اور ہر ایک کے بارے میں تھوڑی بہت بات چیت ہو گئی۔

دہاں سے میں سوتھر جی کی رہنمائی میں آکسفورڈ سرکس پہنچا جہاں براؤ کا سٹنگ پاؤس میں میرا ٹیلی دیڑن پر انٹر ویو ریکارڈ ہونا تھا۔ میں دہاں پہنچا ہی تھا کہ مہندر کوں شریف لے آئے۔ مہندر کوں کشیر کے رہنے والے ہیں اور میں جمبو میں رہتا ہوں اس لیے کوں صاحب دیر تک کشیر اور اہل کشیر کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جس سے کوں صاحب پر دیس میں اپنے وطن کشیر کے لیے اداس ہو گئے ہیں۔ انھوں نے شیر کشیر شیخ محمد فاروق عبد اللہ کی خیر و عافیت کے بارے میں خاص طور سے دریافت کیا اور بہت دیر تک شیخ صاحب کے ساتھ اپنے مراسم اور آن کے ساتھ اپنی حقیقت کی باتیں کرتے رہے۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ جب میں واپس کشمیر جاؤں تو ان کا سلام شیخ صاحب کی خدمت میں عرض کر دوں۔

میں شاید اس بات کا ہمہ ذکر نہیں کر سکا ہوں کہ امریکہ میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے چانسلروصی اللہ خار صاحب مجھے پہنے الی نائے سے انڈیانا ٹیکنیکنیکل ٹکنالوجی تو راستے میں کشمیر اور سیاسیات کشمیر کا ذکر چھڑ کیا تھا۔ اس بات چیت میں وصی اللہ خار صاحب کا یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا تھا کہ شیخ محمد عبد اللہ ہندستان کی ایک ریاست کے محض وزیر اعلیٰ نہیں ہیں بلکہ سارے ملک کے ایک قومی رہنماء ہیں۔

اب انڑو یو شروع ہوا۔ کوئی صاحب نے اردو اور ہندی کے ایک دوسرے پر اثرات کے بارے میں پوچھا تو میں نے ہندی میں غزل اور اردو مشاعروں میں گیت کی مقبولیت کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی دو ہوں کا بھی ذکر آیا اور اسی سلسلے میں جمیل الدین عالیٰ کے دو ہوں کی بات چھڑ گئی۔ میں سمجھتا ہوں جمیل الدین عالیٰ کے دو ہوں کی زبان خود عالیٰ کی اپنی زبان ہے۔ اگر چہ دہلی کے رہنے والے ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے دو ہوں پر براہ راست ہندی کا اثر ہے۔ اس کے باوجود جب ہندی اور اردو کے باہمی تعلق کی بات چلنے کی تو عالیٰ کے دو ہوں کا ذکر ناگزیر ہو گا۔

اب ایک عجیب بات دیکھیے کہ یہ انڑو یو ختم ہوا ہی تھا اور میں اسٹڈیو سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ دروازے پر جمیل الدین عالیٰ سے ملاقات ہو گئی گوپا بقول غالب ڈہ جاتا تھا کہ ہم نکلے، نہ کا گوئے بعد اب ان کے ساتھ ہبھاں لندن میں ملاقات ہو رہی تھی۔ پتا چلا کہ ان کا انڈو یو بھی آج ہی ہے۔ اب میں نے سوچا کہ وہ فارغ ہو یہیں تو تھوڑی دیر ان کے ساتھ بات چیت کریں۔ کوئی بیس منٹ میں عالی صاحب اور کوئی صاحب انڈو یو سے فارغ ہو گئے۔ کوئی صاحب ہم دونوں کو اپنے دفتر میں نہ گئے۔ عالی صاحب نے مجھ سے کہا کہ دسمبر میں جب آپ تو سیعی بیکپروں کے سلسلے میں پاکستان آئیں گے تو آپ کو اسلام آباد بھی جانا ہو گا۔ لاہور اور کراچی کی دعوت تو ہمہ سے تھی۔ اب اس میں اسلام آباد کا اضافہ ہو گیا۔ مجھے اس سے مزید مرست ہوئی۔

یہاں سے فارغ ہو کے عالی صاحب کو لندن یونیورسٹی جانا تھا اور مجھے بی بی اسی کے انڈین سیکشن میں ریکارڈنگ کے لیے جانا تھا۔ کوئی صاحب نے نیکی منگوائی اور

ہم دونوں ان سے اجازت لے کے روانہ ہوئے۔

رستے میں سسلے لندن یونیورسٹی آئی۔ عالی وہاں اُنزر گئے۔ یہاں بل بل سی بیس جا کے اُنزر، آل حسن اپنی برٹش ائر منٹ کے سلسلے میں الوداعی پارٹیوں میں معروف تھے۔ چنانچہ انڈین سیکیشن میں میر انٹرو یو دیپک تر پاٹھی جی نے بیا۔ دیپک تر پاٹھی جی جو اپنے عمل نہر یونیورسٹی میں پڑھا پڑھے ہیں لیکن میری اُن سے ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ انھوں نے زبان و ادب کے بارے میں کئی سوالات کیے۔ ہندستان میں اردو کا کیا مستقبل ہے۔ یہ سوال ہر جگہ پوچھا جا رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندستان میں اردو کے لیے اب مختلف سطحوں پر حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں نے کچھ نہ کچھ کرنا شروع کر دیا ہے اور جب اس طرح کے سوالات ہوتے ہیں تو اب ر باقی رہ جاتی ہے ورنہ تیس سال قبل جب غیر ملکوں میں سوال کیا جاتا تھا تو ایک مایوس کن صورت حال پیش کرنے کے سوا کوہ چارہ باقی نہیں رہ جاتا تھا۔

یہاں انٹرو یو کے بعد یاد رعباس صاحب سے ملاقات ہوئی جو برٹانیہ کے ایک نامور فلم ساز ہیں۔ اُن سے انھارہ بر س قبیل لندن میں پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک بار دہلی تشریف لائے تھے اور پریس انفارمیشن بورو ہی میں اُن سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ اب تجدید ملاقات ہوئی تو دلی سرت ہوئی۔

انھوں نے شام کو غلام علی صاحب کی موسيقی سے لطف اندوڑ ہونے کی دعوت دی لیکن میں نے معدرات پیش کی کیونکہ مہندر کوں صاحب مجھے رات کے لھانے کی دعوت دے پکلے تھے۔ اس دعوت میں ہندستان کے ہائی کمشنر سید محمد صاحب بھی تشریف لارہے تھے۔ میں نے جب دعوت قبول کی تو شرکت کا بخت ارادہ تھا لیکن جب ریکارڈنگ وغیرہ سے فارغ ہو کے کھر پہنچا تو محسوس ہوا کہ کافی تھک گیا ہوں چنانچہ دعوت میں شریک ہونے کا ارادہ بد لانا پڑا اور میلی فون پر مہندر کوں صاحب سے معدرات کر لی۔ رات کو کھر ہی لھانا لھانے کے بعد دیر تک سکھا شش اراج اور زپھوں کے ساتھ با تیں ہوئی رہیں کیونکہ دوسری صحیح مجھے ہندستان روانہ ہونا تھا۔ میلی فون پر پر ملا اوزڈنیس سے بھی کچھ دیر بات چیت ہوئی۔ پر ملا میرے فردشم آنے پر خوش تھی اور میرجا نے بر کافی اُداس ہو گئی۔ یہ قدر تباہ تھی۔ بھی کیفیت میرتی تھی۔

(۳۴)

لندن سے روانگی

رات کو گھر میں باتوں کا سلسلہ دیر تک جاری رہا اور زیندگا وقت اسکی میں نحل گیا۔ چنانچہ جب میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو بہت دیر تک زیندگا آئی لیکن صبح کے وقت جھپٹکی آگئی جس سے طبیعت تروتازہ ہو گئی۔

سازھے آٹھ بجے ہتھروایر پورٹ پر روڈنگ کا وقت تھا۔ میں پیمانگ کر جی رہا تھا کہ فرودشہم سے پر ملا کا ٹیلی فون آیا۔ ڈینس کام پر جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں نے پر ملا سے اوپر جوں سے بات کی اور پھر تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں آٹھ بجے گئے اور سمجھ لے کے ایر پورٹ کو چلے۔ سوتنترا راج اور راجیت بھی ساتھ تھے۔ رستے میں راج اور راجیت اپنی دکان پر اتر گئے اور سوتنتر کے بھائی و نوادہ مبارے ساتھ ہتھرہ تک آئے۔ یہاں ٹکنگ ویزہ کے بعد سب سے اجازت لی۔ اگرچہ میں اپنے گھر کو روانہ ہو رہا تھا لیکن اس وقت سمجھا شد اوپر جوں سے جدا ہوتے ہوئے میں اُس ہو گیا۔ یوں تو ایر پورٹ کے لاڈنگ میں ہندستان آنے والے میں سے زیادہ مسافر تھے لیکن میں ان تین سو مسافروں میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ امریکہ، یونیورسٹی اور انگلستان بھی نکالا ہوں میں تھے اور بندستان بھی خاص کر جموں میں اپنا گھر اور اپنی ایونی و ریٹریٹ میں اپنا شعبدہ اردو۔ میں سوچ رہا تھا کہ طلبہ کے امتحانات کے نتائج لکھ جکے ہوں گے نبی کلاسوں میں پڑھائی شروع ہو چکی ہو گی نہ جانے میرے پرچے میں طلبہ کتنے پچھے رکھے رکھے ہوں گے اگر طلبہ رضا مند ہو گے تو اتوار کو کلام سیدھے کر کے کمی پوری کرنے کی کوشش کر دوں گا۔

تھوڑی دیر میں ہم لوگ طیارے میں سوار ہوئے۔ طیارہ نوبارک سے ایک گھنٹہ بیٹھ پہنچا تھا اس لیے لندن سے بھی ایک گھنٹہ بیٹھ ہی چلا۔ لندن سے اڑان بھرنے کے بعد ہمارے طیارے نے روپار انگلستان کے اوپر سے ہوتے ہوئے ایمسٹرڈام کا رُخ کیا اور وہاں

کولمبس کے دلیں میں

سے روس کی فضاؤں میں داخل ہو گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہم اس وقت ریگا، یشویا، کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ اچانک میرا خیال تین سال پتھر کے ماضی میں انک کے رہ گیا اور میرا بجا کا قیام ایک فلم کی طرح لمحہ میری نظر کے سامنے سے گزرنے لگا۔ سرو جنی نائید و کی شاعری پڑھی۔ ایک ذیلی دُکری یعنی والی رڑکی سگماں نکراوا پاد آئی ہے خدا نے پہیک وقت حسن کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے اور علم و ادب کی دولت سے بھی۔ مجھے ہوشیں ریگا کی وہ شام یاد آگئی جب سگماں نے یشویا اور ہندستانی کے تمدنی رشتہوں پر کوئی دو گھنٹے بات کر کے میرے علم اور حریت دونوں میں اضافہ کیا تھا۔ سننا ہے اب اس کی شادی ہو چکی ہے اور ایک پنجے کی ماں بن چکی ہے۔ بنگالی زبان و ادب کے ماہر پروفیسر وکٹر اوبویس یاد آگئے جن کا اب استقالہ ہو چکا ہے اور جو مغربی ملکوں میں ٹیکوڑ پر حرف آخر کی چیخت رکھتے تھے۔ یشویا کے مقبول نزین شاعر ایمنز پاد آئے جن کے کلام نے یا نس رائنس کی ایک سو یہ ہو میں سالگرہ کے موقع پر سامعین کو مسحور کر دیا تھا اور جنہوں نے میری روانگی سے قبل مجھے ریگا کی سیر کرائی تھی اور ہم دیر تک شروع ادب کی باتیں کرتے رہے تھے۔

میں ابھی ان ہی خیالات میں گھٹھا کہ طیارہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔ دن تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجے کا وقت تھا۔ گھڑ کی کاپردہ انٹھایا تو دیکھا کہ باہر اندر چراکھپا ہے۔ رات ہو چکی ہے پوچھا اس وقت ہندستان میں کیا بجا ہو گا۔ ہوش نے بتایا کہ دہاں نونج پچکے ہیں۔ گویا اب تین گھنٹے کا سفر باقی رہ گیا تھا۔

اس دوران میں کھانا بھی ہو گیا، چائے بھی ہو گئی، سامنے فلم بھی چلتی رہی۔ میں نے اپنا زیادہ تر وقت سفرنامہ مکمل کرنے میں صرف کیا۔ کبھی کبھی نظر فلم کی طرف اٹھ جاتی تھی بیکن انسان دراصل دیکھتا اپنی دل کی آنکھوں سے ہے۔ میرے دل کی آنکھیں یا تو میرے سفرنامے پر تھیں اور یا جموں کے چھوٹے سے شہر میں اپنے چھوٹے سے گھر کو دیکھو رہی تھیں اس پر یہ فلم کا چلنائز چلنایا میرے یہ یکساں تھا۔ اسی آننا میں روس کا بیشنتر حصہ گزر گیا۔ حتیٰ کہ سرفند بھی۔ اتنے میں ہوش پھر سے کھانا لے آئی۔ میری گھڑی میں اس وقت ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اگرچہ یہ کھانا بچ یا ڈنر کے مقابلے میں قدر نے کم تھا میں پھر بھی کھانا ہی تھا۔ میں نے کہا کہ ابھی دن کے دو بجے تو آپ نے بچ کھلایا ہے اور اب ساڑھے پانچ بجے ڈنر کے کھا سکیں گے۔ کہنے لگی دہلی میں گیارہ بچ پچکے ہیں۔ مجھے وقت کے اس حساب پر ہنسی آگئی۔

کو لمبیں کے دل میں

میں نے کہا جب آپ کنکرڈ میں ڈیوتی پر ہوتی ہوں گی تو مغرب سے مشرق کے سفر میں ہر دو گھنٹے کے بعد مسافروں کو بیخ بہاڑ نہ کھلاتی چلی جاتی ہوں گی کیونکہ کنکرڈ تو بارہ تیرہ سو میل ایک گھنٹتے کی رفتار سے پرواز کرتا ہے۔ کہنے لگی مجھے کنکرڈ میں سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا سیکن اس میں بھی دو کھانوں کے درمیان وقفہ رکھا ہی جاتا ہو گا۔

اب کافی دیر سے کوئی اعلان نہیں ہوا تھا سیکن غائب اغذی گزر چکا تھا اور مشاید فورٹ سندھ میں بھی۔ جب سفر میں ایک ہی گھنٹہ باقی رہ گہا تھا تو میرا یہ اندازہ کہ ہم پاکستان کے اوپر سے گزر رہے ہیں، صحیح رہا ہو گا۔ باہر اندر ھیرا گھب تھا۔ مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ اور اگر یوچھے نظر اتنا بھی تو کوئی شہر تک سے ہبھی ناجا سکتا تھا۔ پاکستان میں جن دو شہروں کے اوپر سے ہمیں گزرنے تھا وہ تھے فورٹ سندھ میں اور رحیم پار خاں۔ رحیم پار خاں کا خیال آتے ہی عبد السلام (مرحوم) ممبر سینٹرل اسمبلی پاکستان پا دا آگئے۔ ان سے میری آخری ملاقات دسمبر ۱۹۷۶ء میں ہوئی تھی جب میں اقبال عالمی کانگرس میں شرکت کے لیے پاکستان گیا تھا۔ مرحوم مجھے ملنے کے لیے انٹر کا شیمنٹل ہو ٹل لادھو ریس تشریف لائے تھے۔ والد محترم کے کلام کے دلدادہ تھے۔ ان کے اکثر اشوارہ انھیں پا دتھے۔ میں نے انھیں والد محترم کے کلام کے دو مجموعے پیش کیے تھے، نیز نگ معانی اور شعلہ نوا۔ انھوں نے مجھے رحیم خاں آنے کی دعوت دی تھی سیکن میں یہ فرمایش بوری نہ کر سکا۔ چند روز بعد میری روانگی کے وقت انھوں نے مجھے ایک خوبصورت ٹائی عنایت کی تھی جو بھی نک مرحوم دوست کی پادگار کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔

انتئے میں اعلان ہوا کہ اب بارہ بجھنے کو ہیں اور ہمارا اطیارہ دہلی کے فضائلِ مستقر بر اتر نے والا ہے۔ چنانچہ میں نے پسے زیر تحریر سفر نامے کے اور اقیمتی انھیں بریف کیس میں رکھا اور پالم پر اترنے کے لیے تیار ہو گیا۔

(۳۴)

اپنے گھر میں

رات کو بارہ بجے میں پالم کے ہوانی اڈے پر آترا۔ طیارے سے سامان کے اترنے اور میرے اسیکریشن اور لائنز سے فارغ ہونے میں کوئی ایک لکھنٹہ لگ گیا۔ ایک بنجے میں اندر ون مدلک کی پروازوں کے لاڈنچ میں بہنچا اور وہاں پہنچتے ہی انڈین ایر لائنز کے ان کارندوں کے "خُسن سلوک" سے سابقہ پڑا جو وہاں موجود تھے۔ بس اس کے سوا اور کیا کہوں کر جی خوش ہو گیا۔ انکو اُرمی کا دنٹر پر جو صاحب تھے وہ اخلاق کا محترم نظر آئے۔ مغرب اور مشرق! یہ یہیں تفاوت رہ از بحاست تاہ بجا۔ بہر حال یہ کہ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ آزاد صاحب! یہ ہندستان ہے۔ یہاں اگر کوئی ذاتی طور پر آپ کا واقف ہے تو آپ کی بہر منزل آسان ہوئی چلی جائے گی اور ذاتی طور پر کوئی واقف نہیں ہے تو طیارہ گاہ ہو یا ریلوے اسٹیشن! آپ کسی سے کسی Courtsey کی توقع نہ رکھیے۔ یہ کوئی روں، امریکہ، کینیڈا، فرانس جرمنی یا برطانیہ نہیں ہے جہاں ریلوے اسٹیشن پر یا فضائی مستقر پر ریلوے اسٹیشن یا فضائی مستقر کا بزرے سے بڑا افسر خود خود آپ کے پاس پہنچ جائے گا اور اور اس خوش اخلاقی کے ساتھ سوال کرے گا

May I help you?

کہ آپ کا آدھا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ایک دن قبل ہی صبح کو دل خالصہ کے دوار اکیس انڈین ایر لائنز کا بوئنگ طیارہ ہائی جیک کر کے پاکستان لے گئے تھے۔ انڈین ایر لائنز کے جو کارندے طیارہ گاہ پر موجود تھے وہ اپنے فرانچ منصبی سے بے نیاز مختلف گردہ بنائے ہوئے اسی طیارے کے متعلق کچھ شپ میں مصروف تھے۔ میری موجودگی ہی میں اس طیارے کے بھن مسافر جنہیں مائی

جیکروں نے رہا کر دیا تھا پالم واپس پہنچنے اور انہیں ایر لائنز کے تمام کارندے جب تک
یہ مسافر موجود رہے انہیں دیکھتے رہے ہیں جسے اسی مقصد کے لیے وہ آدھی رات کو ڈیوٹی پر آئے
ہوں۔

بہر طور میں فوکر فینڈ شب کے ذریعے صبح سات بجے پالم سے روانہ ہو کر ۹ بجے
جموں پہنچ گیا۔ اس وقت گھر پہنچنے کی مسیرت بھی دل میں تھی اور امریکہ کیسیدا اور برطانیہ کے
احباب کی محبت کا نقشہ بھی نظر کے سامنے تھا اور آتش کا یہ شریماد آرم انھاس
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ما شجر سایہ دار راہ میں ہے

مکتبہ جامعہ ملیٹڈ کی نئی اور جدید مطبوعات

نمبر	نام	تفصیل	تفصیلی معنائیں
۱/۱:	داؤ درہ بیر	(سوائی نہر پہ وست)	بائیں بچھے سرطی سی
۲/۱:	بیگب رضوی	(تحفہ)	خروناہ
۳/۱:	ڈاکڑ محمد اکرم خان	(تسلیم)	تعلیم و تربیت اور والدین
۴/۱:	جیجن ناٹھ آزاد	(سرپرہ)	کلبس کے دیس میں
۵/۱:	عین حنفی	(درست)	پھر بونے چکن۔۔۔
۶/۱:	رفعت سروش	(رناول)	ریت کی دیواریں
۷/۱:	کشیری لال ذاکر	(رناول)	منہر بارول
۸/۱:	کشور تاہیہ	(شری بود)	واڑوں میں پھیلی بکر
۹/۱:	زائدہ دار	(شری بود)	آنکھوں میں سندھ
۱۰/۱:	انتظار صین	(رناول)	تذکرہ
۱۱/۱:	بندی جعفر	(اسانس)	ذسے کی کہانی
۱۲/۱:	مرودا اسلم جیراج پوری	(رسویغ)	حیات جانی
۱۳/۱:	پرانی سری ریاضی المثلث شیر قافی	(خطہ)	سداناں بندت وقت کے طالبات
۱۴/۱:	رتہ۔ بعد الحق فان	(معاہد)	نقش ذاکر
۱۵/۱:	شہزادن کسن	(تائی)	بندستانی ملاؤں کی توں تبلیغی تحریک
۱۶/۱:	مادہ بن آزاد فاروقی	(ملہ)	وہیا کے بڑے شبب
۱۷/۱:	ڈاکڑ صدمت انتہ	(اصدیں)	تھیلی نفسی سکھیجے فلم اور دیگر معاہد
۱۸/۱:	ڈاکڑ محمد اکرم خان	(تسلیم)	صلیم اور رہنمائی
۱۹/۱:	سیناں الدین	(تسلیم)	ہم اور دوپکے پیمانے
۲۰/۱:	ترم غیرہ خل	جنون منگو	یاروں کا اجازہ
۲۱/۱:	روزہ، خلد، سین آزاد فاروقی	(اسدیں)	بندستان میں اسلامی طوم و ادبیات
۲۲/۱:	بروفسیور جن ناٹھ آزاد	(لغہ)	پشکن کے دیس میں
۲۳/۱:	روزانہ خلو	(شری بود)	آنکھ اور خواب کے دریافت
۲۴/۱:	بم عل	(اسانے)	سہابہ ربانی
۲۵/۱:	ترورن گاردن	(اسانے)	دل دیا
۲۶/۱:	شیخیت فرمت	(اسانیت)	راہگز نہر
۲۷/۱:	مرتبہ، اوز بجاو	(شری بود)	رات کے سافر
۲۸/۱:	ترم، اوز، علیم	(اڑا، اوز)	زوال کا بوجہ
۲۹/۱:	فسر ایبن آزاد فاروقی	(تنقیدی معاہد)	اشیات و فعل
۳۰/۱:	رتہ، میں جو نو زیوی	(محبود معاہد)	ہبہ ایم۔ ہبہ مطالبو
۳۱/۱:	یونت ۳۰۰	(اہ بند معاہد)	نی ایال
۳۲/۱:	مایتی می تاور	(شری بود)	جب ہفت روشنی
۳۳/۱:	ظریفیا	(اول)	فرار
۳۴/۱:	سرو ہائیکن	(اسانے)	بن جرس، بن آدیں
۳۵/۱:	ہن فیرستا زیں	(تنقیدی معاہد)	نہہ جن
۳۶/۱:	سین اسکن پنبل	(شری بود)	خواز شب
۳۷/۱:	خزر راما	(اہ بند)	سرپرہ کی شیشیں تحریک
۳۸/۱:	دکسدم	(اصدیں)	ہنہ بیکشیں کا فرزیں تھے مل مفرک (زادا)